ہلالِ غم

(رثائی کلام ہلال امروہوی)

تحقیق و تدوین و مقدمہ

(خاندانِ کمال امروہی کی رثائی ادب میں خدمات)

ڈاکٹر عظیم امروہوی

پیشکش: عالمی مرثیہ سینٹر، نئی دہلی

ہلال غم

(رثائی کلام ہلال امروہوی)

تحقیق، تدوین

و

مقدمہ

خاندانِ کمالؔ امروہی

کی رثائی ادب میں خدمات

ڈاکٹر عظیم امروہوی

پیشکش: عالمی مرثیہ سینٹر، نئی دہلی

نام کتاب : ہلال غم

مصنف : ڈاکٹر عظیم امروہوی

طبع اول : 2011ء

تعداد اشاعت: دو ہزار

پیش کش : عالمی مرثیہ سینٹر، نئی دہلی

موسیٰ اپارٹمنٹ 6،اے ذاکر نگر، جامعہ نگر

نئی دہلی 110025،فون نمبر: 09250686517

کمپوزنگ : نوشاد عالم ندوی، 9015763829، 9999281492

مطبوعہ :

سرورق : سلیم امروہوی

ملنے کے پتے

(۱) تاجدار امروہوی، راکی ہل، نزدیک رضوی انجینئرنگ کالج، رضوی کامپلیکس

شرلی راجن روڈ، باندرہ (ویسٹ) ممبئی، فون: 09323273317

(۲) بزم تجدید مرثیہ سفینۂ اختر کمال امروہی روڈ۔

دربار شاہ ولایت امروہہ (یوپی) 244221۔

(۳) المصطفےٰ پبلیکیشن فیس 2، اوکھلا وہار، نئی دہلی 110025۔ الہند

فون نمبر: 09213104134

فہرست

انتساب

جدِّ اعلیٰ

سید العارفین

حضرت سید حسین شرف الدین

شاہ ولایتؒ

کے نام

التماس

سورہ فاتحہ

برائے

ایصال ثواب

سید انیس حسن ہلاؔل مرحوم ولد سید نصیر حسن نصیؔر مرحوم

سید امیر حیدر کماؔل امروہی مرحوم ولد سید انیس حسن ہلاؔل مرحوم

سیدہ آلِ زہرہ (محمودی بیگم) مرحومہ دختر سید جمال حسن مرحوم

مہ جبیں ناؔز مرحومہ دختر علی بخش مرحوم

خانوادۂ کمالؔ امروہی

کا علمی وادبی شجرہ

مخدوم حضرت سید حسین شرف الدین شاہ ولایتؒ

⋮

سید ابدال محمد

|

سید عطا احمد عطاؔ

|

سید سلطان احمد سلطانؔ

|

سید تصدق حسین شایاںؔ

|

سید امیر حسن امیرؔ

|

سید نصیر حسن نصیرؔ

سید نفیس حسن نفیسؔ — سید انیس حسن ہلالؔ — سید شفیق حسن ایلیاؔ — سید وحید حسن وحیدؔ

سید انیس حسن ہلالؔ → سید امیر حیدر (کمالؔ امروہی) → سید تاجدار کمال (تاجدارؔ امروہی)

سید شفیق حسن ایلیاؔ → سید محمد مہدی (رئیسؔ امروہوی) — سید محمد تقی صدرؔ — سید جون اصغر (جونؔ ایلیا)

سید وحید حسن وحیدؔ → سید عمران حیدر حسینیؔ

پیش لفظ

دادا سید انیس حسن ہلالؔ کا انتقال میری ولادت سے بھی برسوں پہلے ہوگیا تھا۔ اس لئے انھیں میرے دیکھنے کا تو سوال ہی نہیں۔ لیکن دادا مرحوم کے بارے میں کبھی کبھی بابا مرحوم (سید امیر حیدر کمالؔ امروہی) سے بات ہوتی تھی تو بابا بتاتے تھے کہ دادا ایک بہت نیک اور مومن انسان تھے۔ شاعر بھی تھے اور مرثیہ خوان بھی۔ لیکن کبھی ان کا کلام دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ دادا مرحوم کی عمر بھی کم ہوئی اور انھوں نے جو کچھ کلام کہا وہ اس لیے محفوظ نہیں رہ سکا کہ بابا اور ہمارے تائے جی سید رضا حیدر مرحوم روزگار کی وجہ سے امروہہ سے باہر رہے۔

لیکن — میری حیرت کی اس دن انتہا نہ رہی جس دن بھائی عظیم (ڈاکٹر عظیم امروہوی) نے مجھے دادا مرحوم کے سلام اور مرثیے ان کے ہی قلم سے لکھے ہوئے دکھائے۔ دراصل بھائی عظیم صرف شاعر ہی نہیں بلکہ ادیب اور محقق بھی ہیں اور رثائی ادب میں تو وہ پوری اردو دنیا میں ممتاز مقام رکھتے ہیں اور نہ جانے اُن کی کتنی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

بہر حال حیرت کے ساتھ ہی یہ سلام و مراثی دیکھ کر مجھے بے حد خوشی بھی ہوئی۔ جب میں نے یہ کلام پڑھنا شروع کیا تو دل میں خیال آیا کہ کیوں نہ اسے کتابی شکل دی جائے اور محفوظ کر دیا جائے تاکہ دادا کا کلام کتابی شکل میں برسوں باقی بھی رہے اور ان مرحوم کی روح کو ثواب بھی پہنچے۔ ساتھ ہی پڑھنے والے بھی

ثواب حاصل کریں۔ بھائی عظیم سے اس خیال کا ذکر کیا تو انھوں نے بھی میری رائے کو پسند کیا۔ وہ میرے ذہنی اور دلی طور پر ہمیشہ سے قریب رہے ہیں۔ اُن کی طرف سے ہمت افزائی نے ہی مجھے بھی کبھی کبھی سلام کہنے پر آمادہ کیا ہے۔

اکثر—— گھر میں بابا سے بزرگوں کا ذکر سنتا تھا کہ ہمارے، دادا، پردادا اور اُن کے دادا وغیرہ سب عالم، فاضل، شاعر اور ادیب ہوئے ہیں۔ لیکن خاندان کی ادبی خدمات کہیں باقاعدہ تحریر نہیں کی گئیں۔ اس لیے سوچا کیوں نہ ان سلاموں اور مرثیوں کے ساتھ ہی بزرگوں کی ادبی خدمات بھی شامل کرلی جائیں۔ لیکن یہ کام بھی صرف بھائی عظیم ہی کرسکتے تھے۔ اس لیے میں نے اُن سے ہی گزارش کی کہ آپ وقت نکال کر اس سلام و مراثی کے مجموعے کے لیے تفصیلی مقدمہ ایسا لکھ دیں کہ جس میں ہمارے گھرانے کی ادبی تاریخ بھی شامل ہوجائے۔ انھوں نے میری درخواست تو مان لی لیکن یہ کہا کہ مکمل ادبی خدمات بیان کرنے کے لیے تو کئی سو صفحات کی کتاب ہوجائے گی اس لیے صرف رثائی ادب میں جو خدمات ہیں اُن کو شامل کرنا مناسب ہوگا۔

بھائی عظیم امروہوی امروہہ کی ادبی تاریخ اور اردو مرثیے کی تاریخ دونوں پر Authority ہیں۔ انھوں نے تفصیلی تاریخی مقدمے کے ساتھ یہ سلام و مراثی ترتیب دئے ہیں۔ جس کے لیے میں ان کا بے حد شکرگزار ہوں۔ اور میرے ساتھ ہی کل اولادِ عطا احمد عطا (مقیم ہندوپاک، یورپ اور امریکہ وغیرہ) کو شکرگزار ہونا چاہیے۔ اُن کی اس خدمت کا صحیح اجر بھی مولا کے دربار سے ہی ملے گا۔ میں تو اُن کی صحت کے ساتھ لمبی عمر کی دعا کرسکتا ہوں۔ تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ علمی، ادبی اور مذہبی خدمات انجام دے سکیں۔ آمین

غلامِ غلامانِ احمد مختارؐ و عترتِ اطہارؑ، خاکسار، تاجدار امروہی

25.06.2011

Dr. Azeem Amrohvi
Chairman AalamiMarsia Centre
Moosa Apartment,6A Zakir Nagar
Jamia Nagar,New Delhi-110025

ڈاکٹر عظیم امروہوی
چیئرمین عالمی مرثیہ سینٹر، موسیٰ اپارٹمنٹ
6/اے ذاکر نگر، جامعہ نگر، نئی دہلی،
9250686517-9211737918

خاندانِ کمالِ امروہی

کی

رثائی ادب میں خدمات

علم۔آلِ رسولؐ کی میراث ہے، کیونکہ انھیں علم، مدینۃ العلم (علم کا شہر) باعث تخلیق کائنات حضرت محمد مصطفیٰؐ سے بذریعہ باب العلم (علم کے شہر کا دروازہ) مولائے کائنات حضرت علیؑ سے ورثے میں ملا ہے۔ روز ازل سے روز ابد تک کے لیے روئے زمین کے سب سے بڑے عالم کا نام علیؑ ہے اور سب سے بڑے معلم کا نام محمدؐ۔ نہ آج تک ایسے عالم و معلم ہوئے اور نہ تا روز قیامت ہوں گے۔ مرسل اعظمؐ کی یہ حدیث جس میں انھوں نے انا مدینۃ العلم و علیؑ بابہا فرمایا ہے۔ بے حد معنی خیز ہے خود کو شہر علم کہہ کر تمام علوم کا احاطہ کرلیا کیونکہ شہر میں ہر شے ہوتی ہے اور حضرت علیؑ کو علم کے شہر کا دروازہ کہہ کر علم حاصل کرنے کا صحیح ذریعہ بتادیا۔ یعنی علیؑ کے بغیر وہ علم حاصل نہیں ہوسکتا جو محمدؐ کے پاس ہے اور محمدؐ کے پاس پوری کائنات کا علم ہے۔

ابتدائے آفرینش سے آج تک کسی بھی خطہ زمین نے ایسا بشر پیدا نہیں کیا

اور آسمان نے آج تک کسی کی زبان سے یہ نہیں سنا اور خلاؤں میں یہ اعلان کسی کی زبانی نہیں گونجا کہ جو کچھ پوچھنا ہو مجھ سے پوچھ لو اس سے پہلے کہ میں تمھارے درمیان نہ رہوں۔ سوائے باب العلم حضرت علیؑ کے سورج نے اپنی آنکھوں سے یہ دعوہ کرنے والا ایک اور صرف ایک ہی انسان دیکھا ہے۔ دنیا نے لاکھ چاہا کہ علیؑ کو لاجواب کردے اور ان کے اس دعوے کو غلط ثابت کردے لیکن لسان اللہ کی زبان پر آئے ہوئے لفظوں کی کاٹ بھی ناممکن تھی۔ صاحب ذوالفقار کی زبان سے ادا ہونے والے اس فقرے کو میدان علم کا بڑے سے بڑا شہسوار نہ کاٹ سکا اور کائنات میں منبر سلونی کی زینت صرف ذات علیؑ بن سکی۔

شہر علم کے دروازے سے عصمت کی راہوں پر قطار در قطار گیارہ چراغِ علم کا سلسلہ ہوتا ہوا وارث مدینۃ العلم تک پہنچا۔ علم کے ان چراغوں سے ہر ہر دور میں نہ جانے کتنے چراغ روشن ہوتے گئے۔

حضرت امام علی نقیؑ سے ہوکر یہ سلسلہ سید العارفین حضرت سید حسین شرف الدین شاہ ولایتؒ تک آیا، جنھوں نے سرزمین امروہہ پر پہنچ کر اسے جگمگا دیا اور اس کی تقدیر بدل دی وہ عارف تھے ایسے کہ سید العارفین کہلائے۔ وہ عالم تھے ایسے کہ اپنی مثال آپ تھے۔ وہ عابد تھے ایسے کہ برسوں دامن کوہ میں عبادت کی اور یاد الٰہی میں غرق رہے اور وہ صاحب کرامت تھے ایسے کہ 6-7 کرامات تو ان کی حیات میں تھیں اور ایک کرامت جاریہ آج بھی دیکھ کر انسان انگشت بہ دنداں ہو جاتا ہے کہ بچھو جیسا موذی اپنی فطرت کے خلاف موذی نہیں رہتا اور کسی کو اذیت نہیں پہنچاتا۔ جب کہ آج کے دور کا انسان بچھو سے زیادہ موذی ہوتا جا رہا ہے۔

حضرت شاہ ولایتؒ کے بعد یہ سلسلہ نسل در نسل آگے بڑھتا ہے تو سید محمد منور کے گھر کو مزید روشن کرنے کے لیے سید ابدال محمد کی ولادت ہوتی ہے۔ وہ

صرف نام کے ہی ابدال نہیں بلکہ حقیقت میں ابدال تھے اور اپنے عہد کی ممتاز شخصیت تھے ان کا 'ذکر تاریخ اصغری'، 'تواریخ واسطیہ'، 'تاریخ سادات امروہہ'، 'شجرات سادات امروہہ'، 'تاریخ امروہہ'، اور 'ذکرِ سادات امروہہ'، کتب سے لے کر عصر حاضر تک کے تمام مورخین نے بہت اچھے الفاظ میں کیا ہے۔ مثلاً سید اصغر حسین تاریخ اصغری میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

"سید ابدال محمد منصب دار شاہی تھے۔ نواب دُوندے خاں کے عہد میں بڑی عزت اور توقیر پائی۔ نواب ممدوح ان کو اپنا پیر کہتے تھے۔ سید موصوف نے ایک مسجد تعمیر کی اور کنواں بنایا اور شاہ عبدالرسول کا مقبرہ جن کو دہلی سے اپنے ہمراہ لائے تھے مسجد مذکور کے احاطے میں بنوایا۔ جس کا برج بہت خوبصورت ہے۔ تعلقات دنیاوی کو ترک کر کے اسی مسجد کے ایک مکان میں گوشہ نشینی اختیار کی اور چالیس برس عبادت الٰہی میں مصروف رہے۔ قرآن شریف حفظ تھا" (تاریخ اصغری صفحہ 167)

تاریخ امروہہ کے مصنف محمود احمد عباسی نے مسجد سید ابدال محمد کا ذکر کافی تفصیل سے کیا ہے۔ جس کی ابتداء وہ اس طرح کرتے ہیں کہ:

"یہ خوشنما مسجد بیرونِ شہر متصل محلہ لکڑہ واقع ہے۔ سید ابدال محمد بن سید محمد منور نے 1141ھ میں تعمیر کرائی تھی۔ احاطہ مسجد کے شرقی وشمالی گوشے میں شاہ عبدالرسول قادری کا مقبرہ ہے۔" (تاریخ امروہہ صفحہ 63)

سید ابدال محمد نے مسجد میں نہ صرف اپنی رہائش کے لیے علیحدہ عمارت تعمیر کرائی تھی بلکہ ایک حصہ ایسا بھی تھا کہ گزرنے والے مسافروں کے لیے جملہ آرام و آسائش کے انتظامات کرادئے تھے اور مسافروں کے لیے ایک مسافر خانے کی حیثیت بھی تھی۔

سید ابدال محمد دور مغلیہ میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ اس لیے دہلی میں بھی قیام رہا۔ وہاں شاہ عبدالرسول نثار (جو میر تقی میر کے مخصوص شاگرد تھے) سے قربت حاصل ہوگئی جس کی ایک وجہ تو ابدال محمد کا تصوف کی جانب رجحان تھا اور دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ نثار شاعر تھے اور ابدال محمد سخن فہم و سخن پرور تھے۔ دونوں کی یہ قربت اتنی بڑھی کہ ابدال محمد کے ساتھ شاہ عبدالرسول نثار امروہہ آگئے۔

دیکھئے وقت کس طرح بدلتا ہے کبھی میر تقی میر کی رہنمائی سعادت امروہوی نے کی تو کبھی میر کے شاگرد نثار نے امروہہ آکر میر پر کیا ہوا سعادت امروہوی کا احسان اس طرح چکایا کہ سعادت کے ہم وطن شعرا کی رہنمائی کا فریضہ ادا کیا۔

نثار کا امروہہ آنا تھا کہ اولا د ابدال محمد میں شعر و شاعری کے ماحول میں اضافہ ہوگیا اور فارسی کے ساتھ اردو کی جانب بھی رجحان ہوا اور ابدال محمد کے فرزند عطا احمد عطا عرف اسرار احمد نے فارسی کے ساتھ اردو میں بھی طبع آزمائی کی۔ اس طرح اس خاندان کے پہلے فارسی اور اردو کے شاعر عطا ہوئے۔ جو پانچ صدی ذات کے منصبدار شاہی بھی تھے۔

ابدال محمد نے دربار شاہ ولایت (محلہ لکڑہ) میں جو مسجد تعمیر کرائی تھی اس کی تعمیر کا قطعہ تاریخ سید عبدالرسول نثار کا ہے اور بزرگوں کی سینہ بہ سینہ ایک روایت کے مطابق عطا کا کہا ہوا ہے بہر حال وہ مندرجہ ذیل ہے۔

سید ابدالِ حامی اسلام مسجدے ساخت است عرش مماس
سال تاریخ از خرد گفتہ خانۂ کعبہ را نہاد اساس

1141ھ

(تاریخ امروہہ صفحہ 93 ترتیب اکبر قریشی)

مندرجہ بالا قطعۂ تاریخ پتھر پر کندہ ہوا آج بھی مسجد ابدال محمد کی مرکزی محراب میں

لگا ہوا ہے۔ لیکن شاعر کا نام نہیں دیا۔

بہر حال نثار کے آنے سے اس خاندان میں شاعری کے چرچے بڑھ گئے اور خدا کا شکر ہے کہ آج آٹھویں نسل تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ اس خاندان میں تین سو سالہ قلم کا جو سفر رہا ہے اور علمی و ادبی خدمات انجام دی ہیں ان کا مکمل احاطہ کرنا سخت مشکل ہے اس لیے صرف رثائی ادب میں اس خانوادے کا جو حصہ رہا ہے اس کا سرسری ذکر کیا جائے گا۔

مورخین کا نثار کے بارے میں یہ بھی بیان ہے کہ وہ جب ابدال محمد صاحب کے ساتھ دہلی سے امروہہ آئے تو واپس نہیں گئے اور انھوں نے اپنی عمر کا کافی عرصہ امروہہ میں گذارا اور پھر امروہہ میں ہی رحلت فرمائی۔ نثار کے انتقال کے وقت ابدال محمد حیات تھے اس لیے انھوں نے مسجد کے ہی ایک حصے میں ان کی قبر تعمیر کرائی جس پر ایک شاندار گنبد بنوایا جو مسجد کے موجودہ دروازے سے داخل ہونے کے بعد داہنی جانب ہے چونکہ نثار کا انتقال 11 رمضان کو ہوا تھا اس لیے 11 رمضان کو نثار کا عرس بھی ہوتا تھا اور جو سلسلہ آج سے تقریباً 70-75 سال قبل تک جاری تھا۔ بزرگوں سے سنا ہے کہ عرس کے موقع پر مسجد ابدال محمد عقیدت مندوں سے بھر جاتی تھی۔

بہر حال نثار کے امروہہ میں لمبے قیام کے سبب خاندان ابدال محمد پر ایسی عطا ہوئی کہ ان کے مخصوص شاگرد عطا ہو گئے اور پھر یہ علمی اور ادبی شجرہ اتنا پھلا پھولا کہ گزشتہ تین صدیوں سے امروہہ کے ادبی افق پر چھایا ہوا ہے۔ نظم اور نثر دونوں میدانوں کے نہ جانے کتنے شہسوار یہاں پیدا ہوئے۔ شاعری اور نثر نگاری کی ہر صنف سخن کی یہاں خدمت ہوئی اس کے علاوہ فلسفہ اور صحافت میں بھی اس گھرانے کا گراں قدر حصہ رہا۔ غرض کہ کوئی ادبی اور اسلامی شعبہ ایسا نہیں بچا جس میں اس نسل سید ابدال محمد نے بڑھ چڑھ کر حصہ نہ لیا ہو۔

عطاؔ کے لائق فرزند سلطان احمد سلطانؔ ہوئے۔ سلطانؔ نہ صرف شاعر تھے بلکہ اپنے دور کی امروہہ کی ممتاز شخصیت بھی تھے۔ سلطان کا دیوان خانہ امروہہ کا اس دور میں ادب کدہ بھی تھا۔ وہاں اہل علم وادب کا اجتماع رہتا تھا۔ شعری محفلیں ہوتی تھیں۔ ادبی مباحث ہوتے تھے فن شاعری پر گفتگو رہتی تھی۔ شاعری پر تنقید وتبصرے ہوتے تھے۔ اس لیے مصحفی بھی جب دہلی سے امروہہ آتے تھے تو سلطان احمد سلطانؔ کے دیوان خانے میں قیام رہتا تھا اور خوب خوب محفلیں جمتی تھیں۔ مصحفی نے جہاں تا حیات غزل کی آبیاری کی اور بیشتر کلام تقسیم کرنے کے بعد بھی کئی دیوان چھوڑے وہاں کئی سلام اور ایک مرثیہ بھی کہا۔ مصحفی کا ایک شعر تو کافی مشہور ہے جس میں تہذیب عزا اور مقام عزا کی اہمیت بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

یہ تعزیہ خانہ ہے حسین ابن علیؑ کا یاں بات نہ بے جا کسی انساں سے نکل جائے

مصحفی کا ایک سلام بھی کافی مشہور ہے۔ جس کا صرف ایک شعر ملاحظہ ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ:

جو علیؑ کا حکم نافذ نہ فلک پہ تھا تو پھر کیوں
بگہہ غروب آیا نکل آفتاب الٹا

(اوصاف علی صفحہ 34)

مصحفی کا قلمی مرثیہ راجہ محمود آباد کے ذاتی کتب خانے میں آج بھی موجود ہے، جہاں سے نقل حاصل کر کے راقم نے اپنی تصنیف ''مرثیہ نگارانِ امروہہ'' میں شامل کیا ہے۔ جس کا مطلع اور مقطع مندرجہ ذیل ہے۔

مطلع

تسکین دل کرو مری حیدرؑ کے واسطے بولو تو کوئی روح پیمبرؐ کے واسطے
یا نوکِ نیزہ ودمِ خنجر کے واسطے سر تھا بنا حسینؑ کا افسر کے واسطے

مقطع

مضطر ہے مصحفیؔ غم دنیا سے دیجیے
یا مرتضیٰ علیؑ مری عرضی کو لیجیے
مداحِ اہلبیتؑ کا اک کام کیجیے
آزادی اس غلام کو قنبر کے واسطے

مصحفیؔ کا یہ مرثیہ مربع ہیئت میں ہے اور چونکہ مصحفیؔ اولادِ رسولؐ سے خاص عقیدت رکھتے تھے اس لیے ان کے ایسے اشعار اکثر مل جاتے ہیں مثلاً:

تم مصحفیؔ خستہ کو ہر غم سے چھڑاؤ
یا ابن علیؑ یہ بھی تو اثنا عشری ہے

(مرثیہ نگارانِ امروہہ صفحہ 96)

ہمارے اردو ادب کی تاریخ میں یہ فخر بھی صرف مصحفیؔ کو حاصل ہے کہ تمام شعراء میں ان کے شاگردوں کا شجرہ سب سے زیادہ طویل ہے اور ان کے شاگرد خود نامور استاد ہوئے ہیں۔

یہاں ان باتوں کا ذکر کرنے سے یہ مقصد ہے کہ مصحفیؔ جو خود بھی ایک رثائی مزاج رکھتے تھے ان کے آنے سے اس خاندان کی شاعری اور خصوصاً رثائی شاعری پر بھی اثر پڑا۔ اور اس کے لیے ماحول سازگار بنا۔ مصحفیؔ کی تو غزل پر بھی کربلا کے اثرات ہیں۔ اس وقت یہ موضوع نہیں ہے لیکن صرف ایک غزل کا ایک مطلع ملاحظہ ہو۔ مصحفیؔ کہتے ہیں کہ:

مقتل میں لائی جب مجھے تقدیر کھینچ کر
جلّاد سر پہ آگیا شمشیر کھینچ کر

تاریخ انسانی میں یہ بات صرف امام حسینؑ پر صادق اترتی ہے کہ وہ مدینے سے مقتل کربلا آئے اور وہاں جلاد نے آکر شمشیر سے ان کا سر قلم کر دیا۔

بہر حال نثارؔ کے انتقال کے بعد ادبی ماحول ٹھنڈا نہیں ہوا۔ سلطانؔ کے ذریعے محفلیں قائم رہیں اور مصحفیؔ کے آنے سے اس میں اور بھی اضافہ ہوا۔ اس کے ساتھ ہی امروہہ کی وہ عزائی فضا جس کے سبب امروہہ رثائی ادب کا ایک

بڑا مرکز بن گیا اس میں اس خانوادے کا نمایاں حصہ رہا۔ جونؔ ایلیا نے اس کوچے کا ذکر جس میں یہ سلطانؔ کا دیوان خانہ تھا راقم کی تصنیف میں اس طرح کیا ہے کہ:

''میری گلی میں ایک تخلیقی معصومیت کا رویہ اور ایک ابداعی طرز رفتار دیکھا گیا، کس نے دیکھا؟ میں نے دیکھا۔ اپنی گلی کا بائرنؔ۔ یہ بائرن اس گلی کا ہے جہاں شاہ عبدالرسول نثارؔ (شاگرد میر تقی میر) کی نشست تھی، جس گلی میں مصحفیؔ بھی جب دہلی سے امروہہ آئے تو ضرور محفل جمتی۔ جس گلی میں مفتی محمد عباس (مفتی دربار اودھ) کا بھی آنا ہوا، جس گلی میں سید باسط علی باسطؔ سے خاص طور سے ملنے ڈپٹی نذیر احمد تشریف لائے، جس گلی میں اصغر گونڈوی اور جگر مرادآبادی کا بھی آنا ہوتا تھا۔ جس گلی میں میرے پرداداسید امیر حسن امیرؔ سے ملنے ایران اور عراق کے علماء بھی تشریف لائے، جس گلی میں میرے بابا علامہ شفیق حسن ایلیاؔ جیسا جید عالم بھی پیدا ہوا۔ جس گلی میں بھائی الطاف حسین کو ثر جیسا ماہر لسانیات بھی ہوا جس گلی میں بھائی کمالؔ امروہوی اور رئیسؔ امروہوی جیسے فنکار پیدا ہوئے۔ جس گلی میں بھائی سید محمد تقی جیسے فلسفی اور صحافی نے جنم لیا۔ جس گلی نے قائمؔ امروہوی جیسا شاعر اہلبیت پیدا کیا، جس گلی نے اقبال مہدی جیسا عالمی شہرت کا مصور دنیا کو دیا، آج میری اسی گلی کا بائرنؔ میرا بھانجا ڈاکٹر عظیم امروہوی ہے''۔

(رسولیات صفحہ 11-12)

عبدالرسول نثارؔ (شاگرد میر تقی میرؔ) اور پھر استادالاساتذہ مصحفیؔ امروہوی کے عہد میں امروہہ میں ایک خاص ادبی ماحول بن گیا تھا اور نہ صرف فارسی بلکہ

اردو شاعری کا سفر بھی ارتقا کی راہوں پر جاری تھا اور جس امروہہ کو مشہور سیاح ابن بطوطہ نے 1340ء میں چھوٹا خوبصورت شہر کہا تھا وہ شہر اب آہستہ آہستہ بڑا ادبی شہر بن رہا تھا۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی اس سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

"یہاں گیسوئے اردو سنوارے گئے۔ لکھنؤ دبستان کے عظیم شاعروں ناسخ اور آتش کو اس سرزمین نے استاد فراہم کیا۔ سعادت امروہوی نے میر، شہنشاہ متغزلین کو اردو شعر کہنے پر راغب کیا۔ مرزا عبدالقادر بیدل نے امروہہ ہی کے ایک شاگرد عطا کو اپنا قلمدان بخشا"۔ (نگاہ فقر صفحہ 39)

محمود احمد عباسی رقم طراز ہیں کہ:

"مصحفی امروہوی نہ صرف ناسخ و آتش کے استاد تھے بلکہ رثائی ادب کے دو عظیم شاعروں یعنی خلیق (والد میر انیس) اور ضمیر (استاد مرزا دبیر) کے بھی استاد تھے۔ اردو کے قدیم شاعر مرزا مظہر جانِ جاناں دہلی سے امروہہ آئے اور سید اسد اللہ عرف میر کلو کے مدرسے میں قیام فرمایا"۔ (تذکرۃ الاکرام، صفحہ 164)

مسیح اللہ خاں عطا امروہوی نظم شبیر کے مقدمے میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

"امروہہ کی مردم خیز سرزمین نے جہاں اور متفرق کسب و ہنر میں کامل و اکمل ہستیاں پیدا کیں وہاں فن شاعری میں بھی سیکڑوں شاعر شیریں مقال و ناظم باکمال اور استاد زمانہ انسان پیدا کئے"۔

(نظم شبیر حصہ دوم، صفحہ 3)

جملہ شاعری کے علاوہ امروہہ میں رثائی ادب کا بھی ایک خاص ماحول اسی دور میں شروع ہو گیا تھا۔ سید رحیم بخش نے 'تواریخ واسطیہ' میں ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی نے 'دبستان دبیر' میں اور سید صغیر حسن نے 'انوار قم' میں تحریر فرمایا

ہے کہ میر اُنس۔ ان کے بیٹے پوتے اور بھتیجے، مرزا اوجؔ (پسر مرزا دبیر) مرزا معتلؔ اور میر وحیدؔ وغیرہ امروہہ تشریف لاتے تھے اور اپنے مراثی مجالس میں پیش کرتے تھے۔

امروہہ کو سب سے بڑا فخر یہ بھی حاصل ہے کہ شمالی ہند کا پہلا مرثیہ نگار یعنی میر اسماعیلؔ امروہوی امروہہ نے پیدا کیا۔

بہر حال خاندان کمالؔ امروہی میں عہد مصحفیؔ کا پہلا رثائی ادب کا شاعر سلطان احمد سلطانؔ ہوئے۔ سلطانؔ کی اردو شاعری کا جہاں تک سوال ہے تو غزلیات کا دیوان تو شائع نہیں ہوا۔ غزلیں ضرور کہی ہوں گی جیسا کہ ہر شاعر کے ساتھ ہوتا ہے اب یہ الگ بات ہے کہ کتنی غزلیں کہیں اور ان کا کیا ہوا لیکن راقم جب 1970ء سے 1980ء کے دوران 'مرثیہ نگاران امروہہ' کے عنوان سے تحقیقی کام کر رہا تھا۔ سلطانؔ کے خاندان کی بیاض اور مراثی کا بستہ جو سید رضا حیدر مرحوم (کمالؔ امروہی کے بڑے بھائی) کے گھر تھا کیونکہ وہ سوز خوانی اور مرثیہ خوانی کرتے تھے ان سے حاصل کر کے اس میں اس خاندان کے شعراء کے مراثی تلاش کیے تو اس میں سلطانؔ کا بھی کچھ کلام تھا جن میں کچھ رباعیات اور سلام وغیرہ سلطان تخلص سے بھی تھے۔ سلطانؔ، نثارؔ کے شاگرد تھے۔

راقم نے اس وقت صرف ایک سلام اس بیاض سے نقل کر لیا تھا، جو مہمان کربلا، بیابان کربلا اور اسیران کربلا وغیرہ کی زمین میں تھا۔ اس دور کے کئی شعراء نے اس زمین میں سلام کہے ہیں جو نہ صرف اردو بلکہ فارسی میں بھی ہیں۔ بیاض چونکہ بہت قدیم تھی اس لیے کاغذ خستہ ہو گیا تھا اور کچھ الفاظ سمجھنے میں بھی دشواری ہوئی تھی جو اشعار پوری طرح پڑھے جا سکتے تھے وہ اتار لئے تھے۔ سلطانؔ کا وہ سلام مندرجہ ذیل ہے۔ ملاحظہ ہو:

سلام

پہنچے جو کربلا میں وہ مہمانِ کربلا
پر نور ہو گیا تھا بیابانِ کربلا

جب ذوالفقار اٹھائی تھی پیاسے حسینؑ نے
دریا لہو کا بن گیا میدانِ کربلا

پیاسوں نے اپنے خون سے اک دن میں سینچ کر
گلشن بنادیا ہے بیابانِ کربلا

سمجھے عدو کہ لائے ہیں قرآن اب حسینؑ
ہاتھوں پہ تھا جو اصغر نادانِ کربلا

عباسؑ وقاسمؑ وعلی اکبرؑ ہیں بے مثال
یوسفؑ تم آکے دیکھو حسینانِ کربلا

اصغر کو ڈھونڈا صغرا نے ہر اک کی گود میں
پہنچے مدینے میں جو اسیرانِ کربلا

اس کو بھی پھر تو ناز ہو اپنے نصیب پر
سلطانؑ کو بلائیں جو سلطانِ کربلا

سلطانؔ کا یہ سلام نہ صرف پر تاثیر ہے بلکہ اس میں تبلیغی عناصر بھی ہیں، زبان کی صفائی بھی ہے اور بیان میں روانی بھی ہے۔

سلطانؔ سے شاعری ان کے لائق فرزند تصدق حسین شایاںؔ کو ورثے میں ملی۔ اس خاندانی بیاض میں شایاںؔ کا صرف ایک ہی سلام تھا جسے راقم نے نقل کرلیا تھا۔ اب یہ نہیں کہا جاسکتا کہ شایاںؔ نے اور کیا کیا اور کتنا کہا۔ بہر حال وہی سلام پیش کیا جارہا ہے۔ جو مندرجہ ذیل ہے۔

سلام

محمدؐ کا نواسہ کربلا میں
تھا بھوکا اور پیاسہ کربلا میں

اسے شبیرؑ نے ٹھکرادیا ہے
جو تھا بیعت کا کاسہ کربلا میں

تھا دریا تو، مگر اصغر کی خاطر
نہ تھا پانی ذرا سا کربلا میں

علیؑ کے جائے کا کب لگ رہا ہے
وہاں کوئی شناسا کربلا میں

غضب یہ ہے بھری دنیا میں کوئی
نہیں دیتا دلاسہ کربلا میں

خدا تو بھیج دیتا کوئی بادل
کہیں سے بارہ ماسہ کربلا میں

گلا کٹوا کے باطل کو مٹایا
کیا یوں ستیا ناسہ کربلا میں

چھماہہ تیر کھا کر مسکرایا
ستم کا پلٹا پاسہ کربلا میں

اس سلام میں شایاںؔ کا مقطع تو نہیں تھا، لیکن جس بیاض میں تھا وہاں ان کا نام تصدق حسین اور تخلص شایاں سلام کے ساتھ لکھا ہوا تھا۔

مندرجہ بالا اشعار کے علاوہ دو شعر اور بھی تھے جو 'اثاثہ' اور 'خلاصہ' قافیوں میں تھے جو ظاہر ہے کہ صوتی قوافی تھے اس لیے شایاںؔ نے شعر تو کہے لیکن کاٹ دیئے تھے۔ 'خلاصہ' قافیہ جس شعر میں تھا کاغذ کا وہ حصہ خستہ اور دھندلا تھا جو سمجھ میں نہیں آسکا۔ البتہ 'اثاثہ' قافیہ پر مندرجہ ذیل شعر تھا۔

بچانے دین لے کر آگئے ہیں
حسینؑ اپنا اثاثہ کربلا میں

بہر حال سلام کے مطالعے سے شایاںؔ کی قادرالکلامی ظاہر ہو رہی ہے اور ایسا سلام کہنے والے شاعر نے یقیناً اور بھی سلام و نوحے ضرور کہے ہوں گے اور ممکن ہے کہ کوئی مرثیہ بھی کہا ہو لیکن یہ وقت کی ستم ظریفی کہ کلام محفوظ نہ رہ سکا۔

اس سلام میں 'کاسہ' بطور قافیہ استعمال ہوا ہے اور بیعت کا کاسہ کہا ہے۔ یہ اصطلاح یا ترکیب کاسہ بیعت جو آج کا شاعر استعمال کر رہا ہے یہ شایاںؔ کے ہاں تقریباً ڈھائی سو سال پہلے ملتی ہے۔ اس سلام سے شاعر کی زبان کی صفائی

کا اندازہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ ایک ملاقات میں جونؔ ایلیا نے راقم کے شایاںؔ کے کلام کی بہت تعریف کی تھی اور اس کے محفوظ نہ رہنے پر افسوس بھی کیا تھا۔ شایاںؔ نے ائمہؑ کے معجزات کو 'حدیقۃ الایمان'، نام سے نظم کیا تھا۔

شایاںؔ کے علمی اور ادبی وارث ان کے لائق فرزند سید امیر حسن امیرؔ ہوئے۔ امیرؔ کی مورخین نے بہت تعریف کی ہے کسی نے سلیم الطبع لکھا ہے۔ کسی نے قادرالکلام کسی نے مورخ اور کسی نے ممتاز اہل علم وغیرہ وغیرہ، آپ کے بارے میں سید رحیم بخش تحریر فرماتے ہیں کہ:

''یہ بڑے موقر اور معزز ہیں اور محکمہ لوکل باڈیز کے ممبر ہیں۔ کتب فارسی وعلم عروض خوب جانتے ہیں۔ مرجع اہل محلہ ہیں۔ سب ان کو مانتے ہیں۔ ذی وقعت وذی مقدرت ہیں۔ ایک کتاب ترجمہ 'روضۃ الشہدا' ان کی تصنیف بہت خوبی وفصاحت روزمرہ سے محل اور حسن عبارت ولطیف مضامین سے مجلی ہے اور التزام یہ کیا ہے کہ جس مقام پر فارسی اشعار روضۃ الشہدا میں مرقوم ہیں اسی بحر اور اسی مضمون کے اشعار اردو کتاب ترجمہ میں مذکور ہیں۔ انھوں نے اپنی تصنیف سے ثبت کیے ہیں اور قصائد واشعار وغزلیات وسلام بھی ان کے عمدہ مصنفات سے ہیں۔ اور یہ تاریخ گوئی میں بھی اچھا ملکہ رکھتے ہیں۔'' (تواریخ واسطیہ، صفحہ 513)

امیر حسن امیرؔ کی ولادت تقریباً 1830ء میں امروہہ میں ہوئی اور وفات 1910ء میں امروہہ میں ہی ہوئی اور اپنے خاندانی قبرستان جو مسجد ابدال محمد سے ملحق ہے اس میں دفن ہوئے۔ یہی سن ولادت ووفات 'تذکرہ مرثیہ نگاران اردو' کے مصنف مرزا امیر علی جونپوری نے جلد دوم کے صفحہ 153 پر تحریر کی ہے۔ امیرؔ نے سلام، مراثی، نعت، قصائد، قطعات ورباعیات ہر صنف میں طبع

آزمائی کی ہے۔ ان اصناف کے ساتھ ہی غزلیں بھی کہی ہیں۔ جو اس دور کے مشہور رسالے 'پیام یار' میں شائع ہوئی ہیں۔ صرف ایک غزل کے دو اشعار ملاحظہ ہوں:

بارِ شمشیر سے دکھ جائے سرِ دست نہ ہاتھ
تیغِ ابرو سے فقط قتل کرو تم مجھ کو
کھِل گئے غنچہ نمط آپ گل زخم امیرؔ
آگیا یاد جو قاتل کا تبسم مجھ کو

ماہنامہ 'پیام یار' اکتوبر 1884ء

مولائے کائنات کی مدح میں منقبت کے تین اشعار بھی ملاحظہ ہوں۔ امیرؔ کہتے ہیں:

محرمِ رازِ حق علیؑ ولی واقفِ سرِّ ربِ لم یزلی
کاتبِ نقشِ نامۂ تنزیل خازنِ گنجِ خانۂ احدی
عاشق ان کے رسولؐ سو جاں سے ہیں وہ داماد اور وصیِ نبیؐ

(تذکرہ شعرائے امروہہ، مصنف نقوش نقوی، کراچی پاکستان، صفحہ 272۔)

امیرؔ کی ایک رباعی جوان کے خاندانی بستے سے راقم نے حاصل کی ہے وہ بھی ملاحظہ ہو۔ یہ رباعی بھی مولائے کائنات امیر المومنین حضرت علیؑ کی مدح میں ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

زیبِ دہن و کام وزباں ہے یہ نام آرامِ دل وراحت جاں ہے یہ نام
قربان علیؑ کے نامِ نامی کے امیرؔ ایمان کا نام اور نشاں ہے یہ نام

امیرؔ کے بارے میں بزرگوں کی زبانی یہ سنا گیا ہے کہ انھوں نے کئی اہم تصانیف یادگار چھوڑیں لیکن راقم کی نظر سے صرف ''مطلع الشمس'' (خمسہ ہفت بند کاشی) ہی گزرا ہے جس کا سن تصنیف 1316ھ ہے اور سن طباعت 1317ھ ہے

اور مطبع ریاض صفدری امروہہ نے شائع کیا ہے۔ شاعری کے علاوہ امیر نے ترجمے کا کام بھی کیا ہے یعنی آپ نے ملا واعظ حسین کاشفی کی مشہور فارسی تصنیف ''روضۃ الشہدا'' کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اس ترجمے کی یہ خصوصیت ہے کہ حصہ نظم کا منظوم ترجمہ ہے اور حصہ نثر کا نثر میں ترجمہ ہے۔ اس ترجمے میں زبان کی سادگی پر خاص طور سے زور دیا گیا ہے۔ اور 'روضۃ الشہدا' کے اس اردو ترجمے کو امیر اپنے دور حیات میں خود 25 ذی الحجہ سے روز شام کو اپنے دیوان خانے میں پڑھا کرتے تھے اور اہل محلّہ مرد و خواتین سننے کے لیے جمع ہوتے تھے اور خوب گریہ ہوتا تھا۔ طریقہ یہ تھا کہ ایک جانب مرد اور دوسری جانب خواتین بیٹھتی تھیں درمیان میں پردہ ڈال دیا جاتا تھا۔ امیر کے بعد 'روضہ الشہدا' کو پڑھنے کی روایت ان کی اولاد نے جاری رکھی۔ یعنی نصیر حسن نصیر، نفیس حسن نفیس، انیس حسن ہلال، شفیق حسن ایلیا وحید حسن وحید، سید رضا حیدر، کمال امروہی، رئیس امروہوی، سید محمد تقی، جون ایلیا اور شمیم رضا نے اس سلسلے کو جاری رکھا۔ راقم نے بھی اپنی کم سنی میں اس پروگرام میں شرکت کی ہے۔ اس کتاب کے ترجمے کا نام 'بارانِ غم' ہے۔

جہاں تک امیر کی مرثیہ نگاری کا تعلق ہے تو ان کے خاندانی بستے میں کوئی بھی مکمل مرثیہ نہیں تھا۔ کاغذ کی خستگی کے سبب اوراق منتشر تھے اور اکثر کنارے سے کاغذ خستگی کے سبب علیحدہ ہو گئے تھے جس کی وجہ سے انھیں سلسلہ وار یکجا کرنا اور ترتیب دینا ممکن ہی نہ تھا۔ نہ کوئی مقطع کا ہی بند مل سکا۔ صرف دفتی (گتا) کے سرورق پر تحریر سے معلوم ہو رہا تھا کہ یہ مراثی امیر کے ہیں۔ کیونکہ اس پر تحریر تھا ''مراثی سید امیر حسن امیر امروہوی'' بہر حال ان صفحات کو بحر کی مناسبت سے جب الگ الگ کیا تو معلوم ہوا کہ کم سے کم سات مراثی تھے اگر ایک بحر میں صرف ایک مرثیہ ہو، ان بندوں میں رجز، رخصت، اذنِ جنگ، خیمے میں گفتگو اور پسران جناب زینب

سے ماں کی ناراضگی اور دیگر مکالمے ہیں۔

حضرت عباسؑ کے رجز کے دو بند ملاحظہ ہوں۔ امیرؔ کہتے ہیں کہ:

مشہور خلق ہم بنی ہاشم کے ماہ ہیں
نور خدائے پاک کے نورِ نگاہ ہیں
ہم حاملِ نشانِ شہ کم سپاہ ہیں
اور ہم ہزبر بیشۂ شیرِ اللہ ہیں
کس کی ہے تاب ہم سے کوئی ہم نبرد ہو
دیکھیں نگاہ قہر سے جس کو وہ سرد ہو

او غافلو! کنندۂ خیر ہمیں تو ہیں
او موذیو! درندہ اژدر ہمیں تو ہیں
روح الامیں کے قاطع شہپر ہمیں تو ہیں
جن کا نہیں نظیر وہ صفدر ہمیں تو ہیں
ہم وہ ہیں جن کو چرخ سے تلوار آئی ہے
لوہا ہمارا مانتی، ساری خدائی ہے

ان دونوں بندوں میں جو زورِ بیان اور صفائی زبان ہے اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ رجز جس لہجے کا متقاضی ہوتا ہے وہ ان بندوں میں پوری طرح موجود ہے۔ حضرت عباسؑ کے تیور ہر مصرعے سے جھلک رہے ہیں۔ نور خدائے پاک کے نورِ نگاہ کہہ کر اپنا مرتبہ اور مقام بیان کر دیا ہے۔ لیکن یہ ایک مصرع ہی تعارف حضرت عباسؑ کی پوری دنیا سمیٹے ہوئے ہے جسے پڑھ کر پورے خلا میں نور سا محسوس ہوتا ہے اور عظمت ممدوح بھی سمجھ میں آتی ہے۔ نگاہِ قہر سے دیکھ کر سرد کر دینا اگر ایک جانب رعب و جلال کی دلیل ہے تو دوسری جانب مضمون کی جدت بھی ہے۔

محاورہ کا خوبصورت استعمال بھی ہے۔

اگلے بند میں او غافلو! اور او موزیو! کہہ کر یزیدی فوج کے سپاہیوں کو مخاطب کیا ہے۔ اس تخاطب میں بھی ایک دبدبہ اور رعب ہے اور پھر حضرت علیؑ کا کلہ اژدر کو چیرنے اور جبریل کے شہپر پر ذوالفقار کا نشان پڑ جانے والے تاریخی واقعات کا حوالہ خاندانی شجاعت کو بیان کرنے کا ذریعہ بنائے ہیں۔ لوہے کی تلوار کا آنا اور خدائی کا لوہا ماننا نہ صرف قابلِ فخر دکھایا ہے بلکہ صنعت رعایت لفظی سے بھی سجا دیا ہے۔

امیرؔ نے ایک مرثیے میں حضرت علی اکبر کا رجز کافی تفصیل سے بیان کیا ہے چند بند ملاحظہ ہوں۔

پسر حسینؑ علیؑ کا ہوں اور علیؑ ہوں میں
ولی حق کے ولی عہد کا ولی ہوں میں
اخِ دلاورِ سجادؑ متقی ہوں میں
نبیؐ نہیں، و لے ہم صورت نبیؐ ہوں میں
ہوں سبطِ شاہِ عجم، جد شہِ عرب میرا
عرب، عجم پہ ہے روشن حسب نسب میرا

جو فاطمہؑ کی ہے جاں، اس کی جان ہے اکبر
علیؑ کے نام و نشاں کا نشان ہے اکبر
نظیر جس کا نہیں وہ جوان ہے اکبر
جہاں میں خالق اکبر کی شان ہے اکبر
بگوش ہوش سنو یہ ہے احترام مرا
اذاں میں اسمِ الٰہی سے ضم ہے نام مرا

یہ دی ہے حق نے مجھے قوت جدال و قتال
کہ میرے سامنے رستم سا پہلوان ہے زال
پڑا ہے گور میں بہرام میرے ڈر سے نڈھال
کرو مقابلہ میرا تمہاری کیا ہے مجال

بگاڑی مجھ سے تو نقش فنا بنادوں گا
تمہارے خون کا دریا ابھی بہادوں گا

ان بندوں میں بھی ایک عجیب شان ہے اور بزرگوں کے حوالے سے جو حضرت علی اکبر نے اپنا ذکر کیا ہے اس میں بزرگوں کی منقبت ہے اور دوسرے اور تیسرے بند میں صرف اپنا ذکر کیا ہے۔ ولی حق کے ولی عہد کا ولی اور ہم صورت نبی کہہ کر نہایت بلیغ انداز میں فضیلت بیان کی ہے۔ حضرت علی اکبر کی والدہ چونکہ عجم سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس لیے حسب ونسب، عرب وعجم کے حوالے سے ایک ایسی بے مثال فضیلت بیان کی ہے جس کا جواب ممکن ہی نہیں ہوسکتا۔

رجز میں عام طور پر بزرگ مردوں کی شجاعت ودلاوری کے واقعات بیان کیے جاتے ہیں۔ لیکن امیر نے دیکھئے دوسرے بند کے آغاز میں ان کا اپنا تعارف دختر رسولؐ اور نواسی رسولؐ کے حوالے سے کرایا ہے۔ دوسرے بند میں فضائل کے بیان کے بعد تیسرے بند میں تیور کڑے ہوگئے ہیں اور رستم و بہرام کے ذکر کے ساتھ اپنی شجاعت کا ذکر کیا ہے۔ اور ان دونوں کو نہایت کمتر دکھایا ہے۔ بند کی بیت میں ایک طرح کی Warning دی گئی ہے اور 'بگاڑی' اور 'بنادوں' یہ دو الفاظ استعمال کر کے مناسبت لفظی کا بھی اچھا استعمال کیا ہے۔ رستم اور زال میں رعایت معنوی ہے۔

غرض کہ امیر کے مراثی کے رجز کے صرف یہ پانچ بند ہی ان کے لہجے کی کاٹ زبان کی صفائی اسلوب کی دلکشی تیوروں کا تیکھا پن اور مکمل قادرالکلامی کا ثبوت ہیں۔

وہ مرثیہ کہنے پر پوری طرح قادر تھے اور مرثیے پر ان کی مضبوط گرفت تھی کاش وہ تمام مراثی محفوظ رہ جاتے تو ہمارے ادب میں ایک بیش قیمت سرمایے کا اضافہ ہوتا۔ شاید کہیں ان کی نقلیں پہنچی ہوں تو کیا اچھا ہو وہ سامنے آجائیں۔

ایک مرثیے کے دو تین بندوں میں حضرت عباسؑ کی میدان جنگ کے لیے امام سے اجازت مانگنا اور پھر امام کا اذن دینا ملاحظہ ہو امیر کہتے ہیں کہ:

بھائی عباسؑ کرو شہ کی مصیبت پہ نگاہ
بھانجے ہیں، نہ بھتیجے ہیں، نہ باقی ہے سپاہ
ہر طرف دیکھ کے رو دیتے ہیں با نالہ و آہ
قابل رحم ہے اب حال امام ذی جاہ
بھائی کی زیست کا ہوتا ہے سہارا بھائی
تم نہ ہوگے تو جئے گا نہ تمہارا بھائی

اے شجاع ازلی اے اسد شیر خدا
اے مرے لخت جگر تم پہ ہو شبیرؑ فدا
نہ رضا دینے پہ تم ہو گئے بھائی سے خفا
خیر گر ہے یہی مرضی تو کرو عزمِ وغا
راہِ حق میں ہمیں سب کچھ ہے گورا بھائی
جاؤ اللہ نگہبان تمہارا بھائی

تم کو بیٹوں کی طرح بھائی نے پالا بھائی
سمجھا آنکھوں کی ضیا گھر کا اجالا بھائی
نامِ حق تم نے جواب ہوش سنبھالا بھائی
کیسے جاتے ہو مرا گھر تہ و بالا بھائی

حیف صد حیف تمھیں ہاتھوں سے کھوؤں عباسؑ
تم نہیں روؤ مجھے، میں تمھیں روؤں عباسؑ

ہر بند میں ایک خاص مرثیائی فضا ہے جو قاری کو نہ صرف یہ کہ کربلا کے دشت میں پہنچا دیتی ہے بلکہ وہ وہاں سے ہٹ نہیں پاتا۔

ان بندوں میں امام کی پریشانی، تنہائی کا احساس، ایک بھائی کے لیے دوسرے بھائی کی قوت اور پھر راہ حق کی جانب قدم اٹھ رہے ہیں اس لیے رضا دینے کی مجبوری اور پھر یہ کہہ دینا کہ:

ع۔ جاؤ اللہ نگہبان تمہارا بھائی

کس قدر فطری ہے اس میں ایک خاص بے کسی کا لہجہ چھپا ہوا ہے۔

آخری بند کی بیت جنگ کی اجازت نہ دینے کے لیے اتنی مدلل ہے کہ جس کا جواب نہیں یعنی یہ کہنا کہ

ع۔ تم نہیں روؤ مجھے، میں تمھیں روؤں عباسؑ

اجازت جنگ نہ دینے کے لیے سارے عذر اور مجبوریاں اپنی جگہ لیکن یہ دلیل سب پر بھاری تھی جو یقیناً امیرؔ کی ذہانت کی بھی دلیل ہے۔

صرف ایک بند پسران جناب زینب یعنی عون و محمد کی طلب اذن کے سلسلے میں ملاحظہ ہو جس میں طلب اذن پر امام فرماتے ہیں کہ:

اے عون و محمد میں کہوں مرنے کو جاؤ
پھل برچھیوں کے آہ تم اس بھوک میں کھاؤ
میں آنکھوں سے دیکھا کروں تم خوں میں نہاؤ
ماں باپ کو شادی کے عوض داغ دکھاؤ

ماموں تمھیں مرنے کی رضا دے یہ نہ ہوگا
ہمشیر کی دولت کو لٹا دے یہ نہ ہوگا

پسران جناب زینب جب نصرت حق میں تاخیر کرتے ہیں تو اس موقع پر عون و محمد سے جناب زینب اظہار ناراضگی کرتی ہیں۔ امیر کی زبانی بچوں سے ماں کا غصہ ملاحظہ ہو۔

ان دونوں سے کہہ دو کہ وہ اب گھر میں نہ آئیں
راضی نہیں میں مجھ کو وہ صورت نہ دکھائیں
گھر باپ کا جاکر وہ مدینے میں بسائیں
اور یاد مری بھول کے اب دل میں نہ لائیں
ہیں غیر وہ میں نظروں سے اب ان کی نہاں ہوں
بیٹے ہیں وہ میرے نہ میں ان دونوں کی ماں ہوں

یہاں بچوں سے ماں کی ناراضگی کتنی فطری انداز میں بیان کی ہے۔ یہ قربانی بچوں کو چونکہ ماموں کے ساتھ دینی تھی۔ یعنی جناب زینب کے بھائی امام حسینؑ کے حکم پر اور ان کے ساتھ۔ اب یہاں ناراضگی کے موقع پر ماں کا یہ کہنا کہ:

ع۔ گھر باپ کا جاکر وہ مدینے میں بسائیں

ایک عورت کی عین فطرت کے مطابق ہے۔ اور امیر کا نسوانی فطرت سے واقف ہونے کا ثبوت ہے۔

مندرجہ بالا بندوں میں ایک ماں کے وہ جذبات ہیں کہ جب بچے نصرت امام میں تاخیر کر رہے ہیں اس لیے ناراضگی کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ اب ایک دوسرے موقع پر ایک دوسری ماں کے جذبات بھی ملاحظہ ہوں کہ جب نوجوان فرزند مرنے کی اجازت مانگتا ہے تو ماں کے دل پر کیا گزرتی ہے اور وہ دکھ بھری

ماں اپنے کڑیل جوان بیٹے سے کس طرح مخاطب ہوتی ہے۔ امیرؔ کہتے ہیں کہ:

اے بانوئے بیکس کے جگر شاہ کے دلبر
کیا تم نے پیام آہ سنایا مجھے اکبرؑ
یہ دھیان نہ آیا تمھیں مرجائے گی مادر
بانو سے کرو تم یہ سخن وائے مقدر

کہتے ہو یہ ماں سے کہ ہمیں رن کی رضا دے
اکبر مجھے اس جینے سے اب موت خدا دے

مادر تمھیں مرنے کی رضا دے، یہ نہ ہوگا
اک عمر کی دولت کو لٹا دے، یہ نہ ہوگا
ہاتھوں سے تمھیں آہ گنوا دے، یہ نہ ہوگا
خود گھر کا چراغ اپنے بجھا دے، یہ نہ ہوگا

کھو کر تمھیں اے لال کہاں پائے گی بانو
جانے کا لیا نام تو مرجائے گی بانو

ایک ماں کے نفسیات، اس کی تڑپ، اس کی بے چینی اور اس کا جو اضطراب ہے وہ ان بندوں سے محسوس کیا جاسکتا ہے اور ان حالات نے ایک ماں کو زندگی سے بیزار کر دیا ہے اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہے کہ:

ع۔ اکبر مجھے اس جینے سے اب موت خدا دے

مرنے کی اجازت نہ دینے کے سلسلے میں ماں کی یہ دلیل بھی نہ صرف شاعرانہ بلکہ ایسی ہے کہ جس کی کاٹ بہت مشکل ہے کہ:

خود گھر کا چراغ اپنے بجھا دے یہ نہ ہوگا

یہ مصرع وہ ہے کہ جس کے بعد ایک بیٹا ماں کے سامنے لاجواب ہو جائے۔

جب امام حسینؑ مدینے میں کربلا کے سفر کی تیاری کرتے ہیں اور اپنے ساتھیوں کو جو ہمراہ جاتے ہیں ان سے تیاری کو کہتے ہیں تو ایسے موقع پر امام کی وہ بیٹی جو بیمار ہے یعنی فاطمہ صغرا انھیں بیماری کے سبب کربلا لے جانا نہیں چاہتے۔ یہ معلوم ہونے کے بعد والدہ فاطمہ صغرا پریشان ہوتی ہیں اس کیفیت کو امیر اس طرح بیان کرتے ہیں کہ:

کہنے لگی یہ سنتے ہی بانوئے نیک نام
کیونکر اکیلے گھر میں رہے گی وہ یا امام
صغرا کے حالِ زار پہ ہے رحم کا مقام
بچی مری ابھی سے ہوئی جاتی ہے تمام
جب سے سنا ہے سید ابرار جاتے ہیں
چل کر تو دیکھئے اسے غش پر غش آتے ہیں

یہ گفتگو ایک خاص فطری پن لئے ہوئے ہے اور بند کی بیت تو محاکات کا بھی ایک اچھا نمونہ ہے اور پورا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

آخر میں امیر کے ایک مرثیے سے صرف ایک بند اور ملاحظہ ہو۔ جس میں امام حسینؑ کی کمسنی اور پرورش کا ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن کم سنی کے اس ذکر میں فضائل امام بھی شامل ہو گئے ہیں۔ مدح کے بند میں امیر کہتے ہیں کہ:

زہے توقیر وشانِ نور چشم ساقی کوثر
نہیں ہے کوئی مثل ان کا سوائے حضرت شبرؑ
چڑھاتے تھے انھیں کاندھے پہ اپنے روز پیغمبرؐ
کبھی لیتی تھیں زہراؑ اور کبھی آغوش میں حیدرؑ

کبھی روح الامیں شہزادے کا گہوارہ جنباں تھا
یہ عمدہ پرورش کا سبط پیغمبر کی ساماں تھا

امیر حسن امیرؔ کے مراثی کے مندرجہ بالا بندوں کا جائزہ لینے کے بعد یہ ماننا پڑتا ہے کہ انھیں مرثیہ گوئی میں خاص مہارت حاصل تھی اگر ان کے مراثی صحیح وقت پر زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آتے تو امیرؔ آج مرثیہ نگاروں کی فہرست میں ایک مقام کے مالک ہوتے۔

امیر حسن امیرؔ کے فرزند سید نصیر حسن نصیرؔ کو بھی شاعری سے نہ صرف لگاؤ تھا بلکہ ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ گھر کا ماحول اور بزرگوں سے خون میں ملی ہوئی صفات وخصوصیات ظاہر ہے کہ شعر کیسے نہ کہتے۔ لیکن ان کا رجحان زیادہ تر مسمط اور مذہبی شاعری کی جانب رہا۔ گھر میں بچپن سے ہی ادبی بحث ومباحثہ کے علاوہ مذہبی موضوعات پر گفتگو سننے کا اثر یہ ہوا کہ انھوں نے بھی آغاز جوانی سے ہی اسلامی شاعری میں طبع آزمائی کی۔ ظاہر ہے کہ جب اسلامی تاریخی واقعات سننے کو ملیں گے۔ قرآن پر گفتگو ہوگی، تفسیر کا ذکر ہوگا۔ احادیث کا بیان ہوگا۔ معصومینؑ کی ولادت کی محفلوں میں شرکت ہوگی۔ ایام عزا یعنی تقریباً سوا دو مہینے مجالس سننے اور سلام اور مرثیہ سننے کا موقع ملے گا تو ایسے ماحول میں جو شعور پرورش پائے گا وہ سلام ومراثی اور نعت ومنقبت ہی کہے گا۔ یہی سب کچھ نصیرؔ کے ساتھ بھی ہوا۔

بہر حال اس خاندان کے بستے میں سے حاصل کیا ہوا نصیرؔ کا ایک سلام مندرجہ ذیل ہے۔

سلام

اے مجرئی حسینؑ کا غم یادگار ہے
سرخی سے آسمان کی بھی آشکار ہے

اے ظالمو! رسولؐ کی جو یادگار ہے
برچھی کا پھل کلیجے سے بھی اس کے پار ہے

برچھی جگر پہ کھائی ہے کڑیل جوان نے
دکھیاری ماں کا خیمے میں سینہ فگار ہے

دو بوند صرف پانی پلادو اسے تم اب
اے ظالمو! رباب کا یہ شیر خوار ہے

گردن پہ جس کی ہے ترا خنجر یہ سوچ لے
شمرِ لعیں یہ دوشِ نبیؐ کا سوار ہے

پیروں میں اک مریض کے بھاری ہیں بیڑیاں
گردن کا طوق بھی تو بہت خاردار ہے

صغرا کو کیا خبر کہ لٹا گھر رسولؐ کا
اس کو تو سب کے آنے کا اک انتظار ہے

جو غم ہے کربلا کے شہیدوں کا اے نصیرؔ
اس پر زمیں کے ساتھ فلک اشکبار ہے

نصیرؔ کا تذکرہ مورخین نے بہت اچھے الفاظ میں کیا ہے۔ انھیں اہل علم، بااثر اور ممتاز شخصیت لکھا ہے۔ صاحب 'تواریخ واسطیہ' ان کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

''یہ عربی خواں وفارسی داں، خوش خط، وضع دار، نیک کردار ہیں''
(تواریخ واسطیہ از سید رحیم بخش، صفحہ 513)۔

اس سے ظاہر ہے کہ نصیرؔ نہ صرف اردو بلکہ فارسی اور عربی کا بھی علم رکھتے تھے۔ نصیرؔ خود صرف ایک اہل علم ہی نہیں تھے بلکہ انھوں نے اپنے چاروں پسران کو بھی اچھی تربیت دی تھی ان کے چار پسر تھے اور چاروں ہی شاعر بھی ہوئے یعنی نفس حسن نفیسؔ واانجمؔ، انیس حسن ہلالؔ، شفیق حسن ایلیا واخترؔ اور وحید حسن وحیدؔ وگداؔ۔ چاروں فرزندان نصیرؔ لائق نامور اور اہل علم ہوئے۔

علمی اور ادبی خدمات کے علاوہ آپ قومی اور سماجی خدمات میں بھی حصہ لیتے تھے۔ اس لیے امروہہ میونسپل بورڈ کے ممبر بھی رہے اور بحیثیت ممبر نمایاں خدمات بھی انجام دیں۔ دراصل آپ کو امروہہ کے عوام میں بھی ایک ہر دل عزیزی حاصل تھی۔ جس کی ایک وجہ عوامی خدمات تھیں تو ایک وجہ حسنِ اخلاق بھی تھا۔ نصیرؔ کے فرزند علامہ شفیق حسن ایلیا چونکہ ڈائری بھی لکھتے تھے جو کسی زمانے میں ان کے بعد ان کے چھوٹے پسر جون ایلیا کے پاس تھی اس ڈائری کے مطابق نصیرؔ کا انتقال 19 ماہ صفر 1341ھ مطابق 21/ اکتوبر 1922ء امروہہ میں ہی ہوا اور آپ کی عمر 69 سال ہوئی۔

نصیرؔ کے انتقال پر شعرائے امروہہ نے قطعات تاریخ وفات کہے۔ اس دور کے مشہور شاعر سید علی تمکین، تمکینؔ امروہوی کے قطعہ تاریخ کے چند اشعار مندرجہ ذیل ہیں جن میں تمکینؔ نے نصیرؔ کے پسران نفیسؔ، انیسؔ، شفیقؔ اور وحیدؔ کے

ناموں کا بھی خوبصورت استعمال کیا ہے۔

وحیدؔ عصر تھے اخلاق و حلم میں مرحوم
شفیقؔ اہل ولا حامیانِ دیں کے انیسؔ

برنگ گل تھے وہ ہر دل عزیز خندہ جبیں
غمِ حسینؑ میں پڑھتے تھے کیا کتاب سلیس

گزارے عمر کے کس لطف سے انہتر سال
جوان و پیر و مسن کے بحسن خلق جلیس

بہ حدِ زیست میانہ روی کی چال چلے
امیرؔ کے تھے پسر و پر نہ تھا مزاج رئیس

برائے سال یہ ہاتف نے دی صدا تمکیںؔ
بنا نصیرؔ حسن کو جناں میں قصرِ نفیسؔ

1341ھ

(یہاں ایک شعر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نصیرؔ مجالس میں ذاکری بھی کرتے تھے) سید نصیر حسن نصیرؔ کے چاروں فرزند شاعر ہوئے یعنی نفیس حسن نفیسؔ، انیس حسن بلالؔ، شفیق حسن ایلیاؔ اور وحید حسن وحیدؔ، ان میں سب سے بڑے نفیسؔ تھے جو گھر کے ماحول کی وجہ سے نہ صرف ادبی ذوق کے مالک تھے بلکہ شعر بھی کہتے تھے۔ لیکن صرف شاعر ہو کر زمینداری پر بھروسہ کر کے گھر نہیں بیٹھے بلکہ محکمہ مالیات

میں امین بٹوارہ کے عہدے پر بھی فائز رہے۔

ایک طرف والد، دادا، پردادا اور سب بھائی شاعر تھے تو دوسری جانب خسر سید آل محمد اقدسؔ بھی امروہہ کے اپنے عہد کے ممتاز شاعر اور مرثیہ نگار تھے۔ اس طرح آپ چاروں جانب شعر و شاعری کے ماحول سے گھرے ہوئے تھے۔ نفیسؔ کی ولادت انیسویں صدی کے ربع سوم میں ہوئی تھی۔ لیکن صحیح سن ولادت نہیں ملتی اور ایک لمبی عمر یعنی تقریباً سو سال زندہ رہے۔ راقم نے اپنی کمسنی میں نفیسؔ کو بہت قریب سے دیکھا ہے کیونکہ ان کا دولت خانہ راقم کے نانا سید اختر حسین مرحوم کے مکان سے صرف دو ڈھائی گز کے فاصلے پر تھا اور آمنے سامنے صدر دروازے تھے۔ لیکن نفیسؔ کی عمر کا وہ دور ایسا تھا کہ بہت نحیف و لاغر تھے لیکن اس کے باوجود حوصلہ مند تھے اور مسجد ابدال محمد روز جاتے تھے، کیونکہ آپ مسجد کے متولی بھی تھے۔

نفیسؔ نے جد اعلیٰ حضرت سید حسین شاہ ولایت سے لے کر اپنے دور تک کا خاندان کا شجرہ بھی تیار کیا تھا جو کسی خطاط کے قلم سے لکھا ہوا تھا اور جو راقم کی نظر سے بھی گذرا تھا۔ شجرہ کی پیشانی پر ان کا مندرجہ ذیل شعر بھی تحریر تھا۔

تاریخ نفیسؔ کر یہ تحریر
طوبیٰ کا شجر ہے شجرۂ میر

1315ھ

اس تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نفیسؔ نے یہ شجرہ اپنی جوانی میں تیار کیا ہوگا اور اسی وقت یہ تاریخ کہی ہوگی۔ نفیسؔ چونکہ لاولد رہے اس لیے ان کا کلام بھی محفوظ نہیں رہ سکا جب اولاد نہیں ہوئی تو اولادِ معنوی بھی محفوظ نہ رہ پائی۔ چھوٹے بھائیوں کا ان سے پہلے ہی انتقال ہوگیا۔ سب سے چھوٹے بھائی وحید آخری عمر میں بصارت سے محروم ہو گئے تھے۔ نفیسؔ کے چند مضامین اور کچھ قصائد و سلام امروہہ

کے قدیم جریدے 'الایمان' میں راقم کی نظر سے 45-40 سال قبل شیعہ مسٹن لائبریری امروہہ میں گذرے تھے۔ وہ کتب خانہ پوری قوم کی ایک تاریخی کتاب تھا۔ اس کتب خانے کے ضائع اور تلف ہونے کا ملال جتنا بھی کیا جائے تو وہ بھی کم ہے۔

بہر حال نفیسؔ کا مختصر رثائی اور منقبتی کلام حاصل ہو سکا۔ ایک نظم جو کربلا کی شیر دل خاتون فاتحِ کوفہ وشام دختر شیر خدا شہید اعظم امام حسینؑ کی بہن کے بارے میں ہے۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ نفیسؔ کہتے ہیں کہ

رسول اللہ نانا ہیں خدیجہ جس کی ہیں نانی
بہن حسنینؑ کی ہے فاطمہؑ زہرا کی ہے جانی

بجز ماں کے تمام عورات عالم سے یہ افضل تھیں
ہزار افسوس امت نے نہ ان کی قدر پہچانی

بحکم حق تعالیٰ زینب خاتون کی آکر
کیا کرتے تھے جبریل امیں گہوارہ جنبانی

مبارک اے حسینؑ اللہ نے دی وہ بہن تم کو
عوض میں آپ کے کردے گی جو بیٹوں کی قربانی

تمہارے ساتھ جائے گی مدینے سے یہ کوفے تک
محبت میں تمہاری سب سہے گی وہ پریشانی

مصائب جھیلتی پھر کربلا سے شام جائے گی
کرے گی راستے میں سب یتیموں کی نگہبانی

جو تم کو یاد کر کے راہِ کوفہ میں یہ روئے گی
تو اس کی پشت پر ماریں گے دُرّے ظلم کے بانی

یہ بی بی عمر بھر غم میں تمھارے خون روئے گی
کرے گی تا حیات اپنی، تمہاری مرثیہ خوانی

محبت ایسی تھی ان کو نہ بھولیں پیاس بھائی کی
بنا روئے ہوئے پیتی نہ تھیں زینبؑ کبھی پانی

شہادت کو حسین ابن علیؑ کی سب چھپا دیتے
یہ بی بی گر نہ کرتی اپنے خطبوں میں رجز خوانی

ہزار افسوس جو ہو چادر تطہیر کی مالک
اسی کی چھین لیں چادر بھی ظلم و جور کے بانی

نفیسؔ اب حضرت زینبؑ سے میری التجا یہ ہے
زیارت کو بلائیں مجھ کو وہ اپنی بہ آسانی

نفیسؔ کے ان اشعار میں رثائیت کے ساتھ ساتھ مدح ومنقبت بھی اور تاریخ کا بیان بھی ہے۔ ابتدا میں سرور کائناتؐ (نانا) اور ملیکہ عرب جناب خدیجہ (نانی) کے ذریعے تعارف کرا کے عظمت زینبؑ کا اظہار کیا ہے اور دوسرے ہی مصرعے میں سرداران جوانان جنت (حسنینؑ) کی بہن اور خاتون جنت (جناب فاطمہؑ) کی دختر کہہ کر تعارف کو بھی مکمل کر دیا ہے۔ یہ وہ اعلیٰ مقام اور بلند مرتبہ ذوات مقدسہ ہیں کہ عرش اعظم بھی جن کے در پر سجدہ کرے۔ کہکشاں قدم چومے۔ ماہتاب ایک اشارے سے دو ہو جائے۔ آفتاب تعمیل حکم میں الٹے پیروں واپس آئے اور ستارہ ان کے عصمت کدے کا طواف کرے۔

اب یہ اوصاف وفضائل خصوصیات وصفات بتانے کے بعد نفیسؔ کہتے ہیں کہ افسوس امت نے ان کی قدر نہیں کی۔ اگر صرف نام لے کر افسوس کا اظہار کرتے تو شعر میں یہ تاثر نہ ہوتا جواب ہے۔ رسول اور خدیجہ کی نواسی حسنینؑ کی بہن اور فاطمہ کی جانی کہنے کے بعد یہ افسوس ظاہر کیا ہے کہ امت نے ایسی شخصیات وذوات والا صفات کی قدر نہیں کی۔ اس طرح بات زیادہ اثر انگیز اور غم ناک ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد مدینے سے امامؑ کے ساتھ کربلا کا سفر تکالیف پریشانیاں، صعوبت، مصیبت، اذیت، بے پردگی، دُرّوں کا ظلم، قید وبند کے حالات، تشنگی، بھائی کی پیاس کی یاد اور بیٹوں کی قربانی وغیرہ وغیرہ کا ذکر نہایت اختصار اور جامع انداز میں کیا ہے۔ اور ایک شعر میں جناب زینب کے اس کارنامے کا ذکر ہے جس کے ذریعہ ذکر واقعہ کربلا باقی رہ گیا۔ یعنی دربار شاہی اور بازاروں میں ان کے خطبے جن کے ذریعہ انھوں نے تبلیغ دین کا فریضہ انجام دیا اور حقیقت یہ ہے کہ:

حسینؑ نام ہے اسلام کو بچانے کا
حسینیت کو بچانے کا نام ہے زینبؑ

نفیسؔ کی اس رثائی نظم کے مطالعے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے یقیناً ایسی نظمیں اور سلام کافی تعداد میں کہے ہوں گے، کیونکہ نظم کی پختگی روانی، فصاحت، سلاست اور تلاش مضامین سے یہ ظاہر ہورہا ہے کہ شاعر نے اور بھی بہت کچھ کہا ہوگا۔ لیکن یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ نفیسؔ کی شاعری محمدؐ وآل محمدؐ اور رثائی ادب تک ہی محدود تھی۔

بہر حال اس خانوادے کے شعرا میں نفیسؔ نے مقدار کے اعتبار سے چاہے کم کہا ہو لیکن ان کا کلام معیار پر پورا اترتا ہے۔ اور رثائی ادب کی خدمات میں ان کا بھی حصہ ہے۔

اس خاندان میں جس شاعر کا رثائی ادب سے سب سے زیادہ تعلق رہا ہے اور جس نے تمام عمر رثائی ادب کی خدمت انجام دی وہ ہیں نصیرؔ کے دوسرے فرزند سید انیس حسن ہلالؔ۔ ہلالؔ کو مراثی وسلام سے خاص دلچسپی تھی جس کی ایک وجہ تو گھر کا ماحول۔ اور گھر کا ہی ماحول کیا وہ دور ایسا تھا کہ پورے امروہہ میں رثائی ادب اور مدح ومنقبت کا ماحول تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ پورے سوا دو مہینے امروہہ میں مجالس عزا کا سلسلہ رہتا تھا جس کی وجہ سے مرثیہ وسلام کے چرچے رہتے تھے۔ ہر سال معصومینؑ و بزرگان دین کی ولادت کے موقع پر نعتیہ اور منقبتی محفلیں ہوتی تھیں اس لیے شعرا خوب خوب طبع آزمائی کرتے تھے لیکن ہلالؔ کے ساتھ ایک وجہ اور بھی تھی وہ یہ کہ ہلالؔ چونکہ خوش لحن تھے اس لیے مجالس میں لحن سے سوزخوانی و مرثیہ خوانی کرتے تھے۔ اب ظاہر ہے کہ ان حالات اور اتنے سازگار ماحول میں ہلالؔ مرثیہ وسلام کیسے نہ کہتے۔

ہلالؔ کو ورثے میں ملی ہوئی شاعری پر ماحول نے اور نکھار پیدا کیا۔ انھوں نے گھر میں ہی پہلے دادا امیر اور پھر والد نصیرؔ سے تعلیم حاصل کی۔ کتب تواریخ ہلالؔ کی ولادت کے سلسلے میں خاموش ہیں۔ پروفیسر مختار حسین نقوی مرحوم کے

بیان کے مطابق انیس حسن ہلالؔ کا انتقال 50 سال سے بھی کم عمر میں ہوا اوران کی کل عمر تقریباً 48 سال ہوئی۔

دوسری جانب رئیسؔ امروہوی لکھتے ہیں کہ ''منجھلے تایا سید انیس حسن انیسؔ مرحوم تھے ان کا انتقال 6 محرم الحرام 1342ھ بروز دوشنبہ امروہے میں ہوا'' (معراجِ نفس رسولؐ، صفحہ 7، مطبوعہ پاکستان)۔ ان دونوں باتوں کو یکجا کر کے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ انیس حسن ہلالؔ کا سال ولادت تقریباً 1294ھ ہوگا۔

انیسؔ کا تخلص ان کے بھتیجے رئیسؔ امروہوی نے انیسؔ لکھا ہے۔ جب کہ ان کا کچھ کلام تو انیسؔ تخلص سے ملتا ہے لیکن زیادہ تر کلام میں انھوں نے ہلالؔ تخلص استعمال کیا ہے اور یہی مشہور بھی ہوا۔ ہلالؔ کی ہی مناسبت سے اسی قافیے پر ان کے فرزند امیر حیدر نے کمالؔ تخلص اختیار کیا۔ شاعری کا آغاز بھی کم عمری سے ہی ہوگیا تھا لیکن صرف 48 سال کی عمر پانے کے سبب ادبی خدمات کا زیادہ موقع نہیں مل سکا اور جتنا کہا بھی ہوگا وہ محفوظ نہ رہ سکا۔ کیونکہ بڑے فرزند سید رضا حیدر محکمہ پولس میں ملازم تھے اس لیے امروہہ سے باہر رہے۔ چھوٹے فرزند کمالؔ امروہوی بھی نوجوانی میں ہی لاہور پہنچ کر فلمی صنعت سے وابستہ ہوگئے تھے اور وہ بھی امروہہ سے باہر رہے۔ غرض کہ زیادہ تر کلام محفوظ نہ رہ سکا۔

ہلالؔ بہت نیک، متقی، پابندِ صوم وصلاۃ اور پرہیز گار قسم کے انسان تھے۔ دنیاداری سے بے نیاز اور مال ودولت کی خواہش سے دور تھے۔ لالچ، حرص اور طمع ان کے قریب سے بھی نہیں گزرا تھا۔ توکل ان کا ایمان اور قناعت ان کی عادت تھی۔ بہت مولائی قسم کے انسان تھے اور محبت محمدؐ وآل محمدؐ سے سرشار رہتے تھے۔

ہلالؔ نے غزل تو غالباً نہیں کہی اور اگر کہی تو شاید دو چار ہی کہی ہوں گی۔ البتہ نعت ومنقبت، مرثیہ وسلام اور نوحہ ضرور کہا۔ ہلالؔ کے جو مراثی ضائع ہونے

سے خاندانی بستے میں بچ گئے یا دیگر مرثیہ خوانوں کے بستے میں بھی ان کی نقول تھیں ان کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔ یہ مراثی یقیناً غیر مطبوعہ ہیں۔ راقم نے یہ 1980ء سے بھی پہلے ہلالؔ کے فرزند اکبر سید رضا حیدر مرحوم سے حاصل کیے تھے۔ مطلع ہیں۔

ع جس دم ادا نماز سحر کی امام نے بند 20

بقلم سید منور حسین تحریر 29 ر اکتوبر 1920ء

ع دیکھ کر چاند محرم کا نمایاں زینب بند 21

بقلم سید انیس حسن ہلالؔ، تحریر 22 ذی قعدہ 1330ھ

ع جب پیاس کی شدت ہوئی بے حد شہ دیں پر بند 43

بقلم سید انیس حسن ہلالؔ، تحریر 20 ذی الحجہ 1325ھ

ع جب سید مظلوم اکیلے رہے رن میں بند 37

بقلم سید انیس حسن ہلالؔ، تاریخ تحریر نہیں۔

ہلالؔ کا پہلا مرثیہ امام حسینؑ اور ان کے رفقا کی نماز سحر سے شروع ہوتا ہے اس کے بعد امامؑ اور ان کی بہن جناب زینبؑ سے جو گفتگو ہوتی ہے وہ مکالمے نظم کیے ہیں۔ آخر میں امامؑ کی شہادت کا بیان ہے۔ یہ مرثیہ روز عاشورہ صبح کی مجلس میں پڑھنے کے مقصد سے ہلالؔ نے کہا ہوگا۔

امام میدان جنگ میں شہادت کے لیے جانے کا ذکر کرتے ہیں تو جناب زینبؑ فرماتی ہیں کہ:

بھیا خبر جو کوچ کی اپنے سناتے ہو
زینبؑ کو کس کے آسرے پر چھوڑے جاتے ہو

امام حسینؑ جواب میں فرماتے ہیں کہ:

شہہ کہتے تھے کہ صبر کرو، صبر، اے بہن
ہوگا وہی جو چاہے گا معبود ذوالمنن

بھائی بہن کے درمیان کی یہ تمام گفتگو ہلالؔ نے بالکل فطری انداز میں نظم کی ہے۔
ہلالؔ کا دوسرا مرثیہ کسی استاد شاعر کے مطلع پر کہا گیا ہے جس کا اظہار انھوں نے خود آخر میں کر دیا ہے۔ جو ہلال محرم دیکھنے کے موقع کا ہے۔ اس میں محرم کا چاند دیکھنے کے بعد جناب زینب اپنے بھائی اور دیگر عزیزوں کے لیے کیا کیا دعائیں کرتی ہیں اور اس وقت ان کے کیا جذبات ہیں۔ کیا احساسات ہیں اور کیا کیا سوچتی ہیں۔ ہلالؔ کی زبانی ملاحظہ ہو وہ کہتے ہیں کہ:

میرے بھائی کو کبھی ہو نہ کوئی رنج و محن
بچے جیتے رہیں سرسبز رہے یہ گلشن
لے کے سب کنبے کو ہمراہ، چلیں سوئے وطن
شاد و آباد ہمیشہ رہیں سلطان زمن
شور ہو خلق میں شبیرؑ کی یکتائی کا
نام قائم رہے دنیا میں مرے بھائی کا

یہ جذبات تو ایک بہن کے تھے اب دوسری جانب بھائی نے جب محرم کا چاند دیکھا تو پروردگار سے کیا التجا کی وہ بھی ملاحظہ ہو۔

اس طرف تو یہ دعا کرتی تھی بنت حیدرؑ
اُس طرف دیکھتے تھے چاند شہ جن و بشر
التجا کرتے تھے اللہ سے یہ رو رو کر
راہ میں تیری شہادت ہو مری اے داور

مہہ زہراؑ کو نصیب ایسی سعادت ہووے
قتل شبیرؑ سے امت کی شفاعت ہووے

آگے بھی ہلالؔ نے اسی قسم کے دردناک مضامین اور اس قربانی کے امتحان میں کامیابی کی دعائیں امام کی زبانی کی ہیں۔ مثلاً:

صبر اور شکر کی یہ دولت نایاب ملے
بدلے پانی کے مجھے خنجر بے آب ملے

یا ایک جگہ فرماتے ہیں کہ:

صابر ایسا ہو، جو پیاسا ہو تو ایسا ہووے
ایسے نانا کا نواسہ ہو تو ایسا ہووے

ایک بیت اور ملاحظہ ہو:

دھیان بیٹے کا نہ بیٹی کا نہ ہمشیر کا ہو
ذکر تحلیل کا، تسبیح کا تکبیر کا ہو

چونکہ ہلالؔ نے یہ مرثیہ کسی استاد کے مطلعے پر کہا تھا اس لیے مقطع میں اس بات کا اظہار اس طرح کیا ہے کہ:

سخن حق یہ اسی احقر ناشاد کا ہے
مرثیہ میرا ہے، مطلع کسی استاد کا ہے

ہلالؔ کا تیسرا مرثیہ جس کا مطلع ہے:

ع۔ جب پیاس کی شدہوئی بے حد شہ دیں پر

اس مرثیے میں امام حسینؑ کا وہ خطبہ نظم کیا گیا ہے کہ جو بروز عاشورہ فوج یزید کے سامنے امام عالی مقام نے دیا تھا جس میں لشکر ظلم کو ظلم وستم سے باز رہنے کو کہا تھا اور سمجھایا تھا اور یہ کوشش کی تھی کہ کسی طرح بھی جنگ ٹل جائے اور جنگ

ٹالنے کے لیے مختلف تجاویز پیش کی تھیں۔ مثلاً

کیوں درپے آزار مرے ہوتے ہو یارو!
دنیا کے عوض دین کو کیوں کھوتے ہو یارو!
عالت پہ مری چھوڑ دو مجھ تشنہ دہن کو
گر رائے تمہاری ہو تو پھر جاؤں وطن کو

یہ مرثیہ 1325ھ کی تحریر ہے ممکن ہے اس سے بھی کئی سال قبل کہا ہو۔ یعنی سو سال سے بھی زیادہ قدیم ہے۔ اس وقت لفظ 'یارو' سے تخاطب کیا ہے جب کہ یہ انداز خطاب مرثیہ نگاروں نے پچاس سال سے بھی زیادہ عرصے بعد اختیار کیا ہے کیونکہ ہلالؔ کے دور میں تخاطب کے لیے لوگو، مومنو، عزادارو، اہل عزا، ماتم دارو، اور سوگوارو جیسے الفاظ استعمال ہوتے تھے۔ دراصل ہلالؔ کافی حد تک ایک نئے ذہن کے مالک تھے۔ ان کے اسلوب میں بھی کہیں کہیں نیا پن جھلکتا ہے۔ آگے چل کر امام حسینؑ فوج یزید سے حجت تمام کرتے ہیں اور میدان سے خیمے کی جانب واپس آجاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ:

یہ کہہ کے چلے جانب خیمہ شہِ والا
تھا پیاس کی شدت سے کلیجہ تہ و بالا
سنبھلا نہ گیا، آپ کو ہر چند سنبھالا
بے ساختہ نکلا دہن خشک سے نالا
پہنچی جو صدا بھائی کی گھبرا گئیں زینب
فوراً درِ خیمہ کے قریں آگئیں زینب

اس کے بعد ایک روایت نظم کی ہے یعنی ایک مومنہ امام حسینؑ اور حضرت زینب کی زیارت کے لیے کربلا پہنچتی ہے۔ امام اس کے لیے دعا کرتے ہیں اور پھر

آخر میں امام میدان کارزار کی جانب روانہ ہو جاتے ہیں۔

لو جاتے ہیں بس اب تمھیں اللہ کو سونپا
گھر فاطمہ زہراؑ کا یداللہ کو سونپا

امام نے اس مومنہ پر یہ ظاہر نہیں کیا کہ وہی امام حسینؑ ہیں لیکن تمام گفتگو کے بعد وہ کہتی ہے کہ:

اس وقت مگر اس کی بڑی ہے مجھے حیرت
آقا سے مرے آپ مشابہہ ہیں نہایت
ہے فرق بس اتنا کہ جواں ہیں مرے حضرت
اور آپ کی اس وقت ضعیفی کی ہے حالت

ہے پشت بھی خم آپ کی اور زرد جبیں ہے
لیکن لب و لہجے میں تو کچھ فرق نہیں ہے

مومنہ کی تمام گفتگو سننے کے بعد امام سے ضبط نہیں ہوا تو مخاطب ہو کر فرمایا کہ:

اے مومنہ زینب یہی آوارہ وطن ہے
شبیرؑ ہوں میں اور یہی میری بہن ہے

یہ مرثیہ فصاحت کے ساتھ مکالمہ نگاری کا اچھا نمونہ ہے اور ایک خاص بیانیہ کیفیت اور تجسس بھی ہے۔

ہلالؔ کے چوتھے مرثیے کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

جب سید مظلوم اکیلے رہے رن میں
وہ زخم لگے جسم شہنشاہ زمن میں
طاقت نہ رہی فرط جراحت سے بدن میں
لکنت تھی، زباں خشک تھی، کانٹے تھے دہن میں

تھا دردِ کمر بھائی دلاور کے الم میں
اور ضعفِ بصر تھا علی اکبر کے الم میں

اس مرثیے میں بھی ہلالؔ نے ایک مومنہ کی روایت بیان کی ہے اور مکالمہ نگاری کا بھی اچھا نمونہ ہے ایک بیت ملاحظہ ہو۔ امام حسینؑ فرماتے ہیں کہ:

مرجاؤں تو آکر تن صد پاش پہ رونا
جی کھول کے پھر بھائی کی تم لاش پہ رونا

امام حسینؑ کی میدان میں جانے کے لیے خیمے سے رخصت سے پہلے ہی مرثیہ ختم ہو جاتا ہے۔ ہلالؔ مقطع میں کہتے ہیں کہ:

اب آگے ہلالؔ ان کی مصیبت نہ بیاں کر
شبیرؑ کی ہمشیر سے رخصت نہ بیاں کر

دراصل ہلالؔ کے تمام مراثی سوز خوانی کے طور پر پڑھے جانے والے ہیں کیونکہ وہ خود سوز خواں تھے اس لیے مختصر بھی ہیں۔ سب سے طویل مرثیہ 43 بند کا ہے۔ لیکن ان مراثی سے ہلالؔ کی فکر و فن کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ واقعہ نگاری، جذبات نگاری، نفسیات نگاری، منظر نگاری اور مکالمہ نگاری میں وہ بہت کامیاب نظر آتے ہیں۔ ان کے ان مراثی میں زور ہے، روانی ہے، تاثیر ہے، الفاظ کی اچھی بندش اور سب سے اہم اور مرثیے کی جو بنیادی چیز ہے یعنی رثائیت، وہ بھی بھرپور ہے۔

جہاں تک ہلالؔ کی سلام نگاری کا سوال ہے تو وہ اس میدان میں بھی کامیاب نظر آتے ہیں۔ ان کے جو چند سلام راقم حاصل کر سکا وہ شامل کیے جا رہے ہیں۔ لیکن ان سلاموں کو دیکھ کر یہی اندازہ ہوتا ہے کہ آج سے سو سال قبل جو ماحول تھا جو رنگ اور اسلوب تھا ہلالؔ نے اسی کی نمائندگی کی ہے۔

ہلالؔ کی عمر نے زیادہ وفا نہیں کی۔ اگر عمر لمبی پائی ہوتی اور سب کلام محفوظ

رہتا تو یقیناً وہ لحن سے پڑھے جانے والے یعنی سوز خوانی کے مراثی کے ذخیرے میں غیر معمولی اضافہ کرتے۔ ان کے مراثی کی یہ تاثیر کا ہی سبب ہے کہ آج بھی ان کے مراثی جگہ جگہ مجالس میں پڑھے جاتے ہیں۔

اس خانوادے میں اگر ایک طرف عالمی شہرت کمالؔ امروہی نے حاصل کی اور عوام وخواص میں مقبول ہوئے تو دوسری جانب تبحر علمی میں سب سے بلند مقام علامہ شفیق حسن ایلیاؔ نے حاصل کیا۔ ایلیاؔ کا بہت اچھے الفاظ میں تمام مورخین نے ذکر کیا ہے اور ان کی علمی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ مثلاً ''مرثیہ نگاران اردو''، ''تذکرہ علمائے امروہہ''، ''مرثیہ نگاران امروہہ''، ''شعرائے امروہہ''، ''تذکرۂ شعرائے امروہہ'' اور ''انجمن وظیفہ سادات ومومنین کا سلور جبلی نمبر'' وغیرہ۔

آپ کی ولادت 14 جولائی 1885ء کو امروہہ میں ہوئی۔ سید اعجاز حسین جارچوی سلور جبلی نمبر میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

''آپ حضرت مخدوم سید شرف الدین حسین شاہ ولایت امروہہ کے خلف اکبر سید علی صاحب قاضی القضاۃ امروہہ کی اولاد میں ہیں۔ سلطان محمد تغلق کے زمانہ حکومت میں اس خاندان کو بہت عروج حاصل ہوا اور اس خاندان کے افراد مناصب جلیلہ پر فائز ہوئے۔ آپ کو قدرت نے ذہن رسا اور طبع سلیم کی نعمت عطا فرمائی ہے۔ چنانچہ بسلسلہ تالیف وتصنیف موصوف عربی، فارسی، انگریزی اور سنسکرت وغیرہ زبانوں سے مدد لیتے ہیں۔ موصوف امور قومی اور مذہبی میں بھی بہت دلچسپی لیتے ہیں۔ چنانچہ 1324ھ میں 'انجمن امامیہ' امروہہ میں قائم کی تھی جو عرصے تک قومی ومذہبی خدمات انجام دیتی رہی اور رجب 1354ھ میں آپ نے 'انجمن تنظیم المومنین' قائم کی ہے جو مغربی طرز کی تعلیم نسواں کے بالکل خلاف ہے'' (صفحہ 132)۔

ایلیاؔ قومی خدمات میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ دیگر تنظیموں کے

علاوہ مشہور قومی و مذہبی انجمن ''تحفظ عزاداری'' کے پہلے ناظم بھی رہے۔

آلیا کو شہرت تو ان کے تخلص آلیا سے ملی، لیکن ابتدائی دور کی شاعری میں شفیقؔ بھی استعمال کیا اور ان کے پسر جون ایلیا کے بیان کے مطابق انھوں نے اپنے بے حد قریبی دوست مثل حقیقی بھائی سید اختر حسین (راقم کے نانا) کے نام کو بھی بطور تخلص یعنی اخترؔ استعمال کیا۔ اس طرح آلیا کے کلام میں آلیا کے علاوہ شفیقؔ اور اخترؔ تخلص کا بھی استعمال ملتا ہے۔

آلیا نے عربی و فارسی کی تعلیم اپنے دادا سید امیر حسن امیرؔ اور والد سید نصیر حسن نصیرؔ سے حاصل کی۔ اس کے علاوہ شہر کے مشہور عالم مولوی اولاد حسن سلیمؔ سے بھی درس حاصل کیا اور شاعری میں بھی ان سے ہی تلمذ حاصل تھا۔

آلیا کے بارے میں ان کے لائق فرزند رئیسؔ امروہوی لکھتے ہیں کہ ''وہ ایک رقیق القلب، نرم خو، دردمند اور شریف النفس انسان تھے۔ ان کی پوری زندگی حصول علم اور طلب عرفان کی راہ میں مسلسل مجاہدے کی حیثیت رکھتی تھی۔ صبح سے شام تک لکھنے پڑھنے کے علاوہ کوئی کام نہ تھا۔ اماں مرحومہ کو یہ طرز زندگی پسند نہ تھا اور اسی لیے وہ کبھی کبھی ان سے الجھ جاتی تھیں۔ اماں کی خواہش تھی کہ وہ حصول معاش میں غرق ہو جائیں اور قلم و کاغذ کو طاق میں رکھ دیں۔ کیونکہ شاعر یا مصنف بن کر کوئی شخص آسودہ حال زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اماں اپنے لیے اور اپنی اولاد کے لیے خوش حال مادی زندگی کی طلب گار تھیں۔ بابا مرحوم ان کی ضرورتوں کو سمجھتے ضرور تھے اور حتی الامکان ان کا دل رکھنے کی کوشش بھی کرتے لیکن یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اپنی علمی مصروفیات ترک کر کے پورا وقت طلب معاش میں لگا دیں۔ مرحوم کے مزاج میں استغنا اور قناعت بدرجہ کمال تھی۔ ان کی کوشش تھی کہ وہ دنیا سے کم سے کم طلب کریں اور دنیا کو اس کی طلب سے کہیں زیادہ عطا کریں۔ ادب شعر، تاریخ، ہیئت، الٰہیات، مذہب اور

روحانیت ان کے پسندیدہ موضوع تھے۔ ان کی سیرت کا نمایاں پہلو یہ تھا کہ شہرت سے قطعاً بے نیاز تھے۔ جیسے دوسروں کے لیے نہیں صرف اپنے لیے لکھتے ہوں۔ اگر چہ انھیں تمام اصناف سخن پر مکمل عبور حاصل تھا۔ لیکن انھوں نے مشاعروں میں شریک ہونے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ البتہ مذہبی محفلوں اور مجلسوں میں وہ ضرور شرکت کرتے اور اپنا نعت و منقبت کا کلام سناتے۔ ہماری سب سے بڑی محرومی یہ ہے کہ ان کے کلام کا بیشتر حصہ ضائع ہو گیا۔

(معراج نفس رسولؐ، صفحہ 3-4)

رئیسؔ امروہوی کی اس تحریر سے ایلیاؔ کی پوری شخصیت، مزاج، عادات و خصلات اور علم دوستی سامنے آجاتی ہے۔ جہاں تک وفات کا تعلق ہے تو ایلیاؔ کے فرزند جونؔ ایلیا اپنی یادداشت میں تحریر کرتے ہیں کہ:

آخر کار ہوا آج سر انجام سخن
جس نے لکھی تھیں یہ سطریں وہ قلم ٹوٹ گیا

ایلیاؔ کی ڈائری پر جونؔ ایلیا نے یہ شعر تحریر کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایلیاؔ کا یہ قلم ٹوٹ کر بھی تین جگہ بٹا اور تینوں قلم بے حد مضبوط، رواں دواں، معنی خیز اور فکر انگیز بن کر دنیا علم و ادب سے اپنا لوہا منوا گئے۔ یعنی رئیسؔ امروہوی، محمد تقی اور جونؔ ایلیا۔

جونؔ ایلیا مندرجہ بالا شعر کے بعد لکھتے ہیں کہ آج 8 جنوری 1956ء بوقت شب ساڑھے نو بجے بابائے جلیل القدر علامہ الشہیر استاد الشعرا سید شفیق حسن نے انتقال فرمایا۔ اناللہ۔

ایلیاؔ کے چوتھے پسر سید محمد عباس شاعر و ادیب تو نہیں تھے لیکن پبلی کیشن کے ذریعے انھوں نے علم و ادب کی خوب خدمت کی۔ دختر صرف ایک ہوئیں شاہِ زناں نجفی جن کی شادی ڈاکٹر سید محمد شفاعت سے ہوئی۔ ایلیاؔ نے غزل نظم، قصیدہ، منقبت، نعت، سلام، نوحہ، قطعہ، رباعی اور مرثیہ ہر صنف سخن میں طبع

آزمائی کی ہے اور آپ کا مطالعہ بے حد عمیق تھا۔ آپ کی تصانیف میں معراجِ نفس رسولؐ (شعری مجموعہ) حقیقت المسیح، الصدق، اصل الاصول، آثار الشہدا، تصدیق المعراج، رئیس العالمین، عالم برزخ، تحقیق السراج، صاحب الزماں اور شہید ازل راقم الحروف کی بھی نظر سے گذری ہیں۔ امروہہ کی زبان کے سلسلے میں آلیا کا ایک قطعہ بہت مشہور ہے۔

اللہ اللہ شانِ امروہہ زہے طرز بیانِ امروہہ
دہلی و لکھنؤ کا ہے اوسط معتدل ہے زبانِ امروہہ

آپ کے تقریباً دس بارہ قصائد بھی راقم کی نظر سے گذرے ہیں جو سب معصومین کی مدح میں ہیں۔ اس کے علاوہ مجموعہ کلام میں بھی 62 قطعات شامل ہیں۔ ان کا موضوع بھی مذہب ہے ان کے علاوہ 5 قطعات راقم نے تلاش کیے ہیں۔ جہاں تک مرثیے کا تعلق ہے آپ کا ایک غیر مطبوعہ مرثیہ پاکستان میں منیب حسن صاحب مرحوم کے پاس تھا اب نہ جانے کس کے پاس ہے۔ یہ بات ڈاکٹر ہلال نقوی نے 'مرثیہ عظیم' کے مقدمے میں تحریر فرمائی ہے۔ مطلع مندرجہ ذیل ہے۔

ع۔ حر کی تقدیر، خوشا قسمت وخوش اقبالی

نعتیہ کلام میں قطعات اور نعت کے علاوہ ایک طویل نعتیہ مسدس 156 بندوں پر مشتمل ہے جو مطبوعہ ہے اور جس میں معراج کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ مسدس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ:

اوج بشر کی شان ہے معراج مصطفیؐ
قدرت کا امتحان ہے معراج مصطفیؐ
رحمت کا اک نشان ہے معراج مصطفیؐ
اک سیر لامکان ہے معراج مصطفیؐ

درسِ عمل عروج رسولؐ خدا کا ہے
انساں کے واسطے یہ سبق ارتقا کا ہے

حضرت علیؑ کی مدح میں بھی ایک بند ملاحظہ ہو۔

اللہ رے قدر و منزلت شانِ مرتضیٰؑ
رتبہ نبیؐ کے فیض سے کیا کیا عطا ہوا
معراج شب وہاں تو یہاں دن میں ارتقا
ان کو براق ان کے لیے دوشِ مصطفیٰؐ
وہ نورِ حق رسولؐ زمین و زمن ہوئے
یہ شانِ کردگار ہوئے بت شکن ہوئے

آگے چل کر حضرت محمد مصطفیٰؐ کا حضرت علیؑ سے تعلق اور دونوں کی ایک دوسرے سے قربت مختلف تشبیہات کے سہارے بیان کی ہے۔ کہتے ہیں کہ:

ہیں مصطفیٰؐ جو پھول تو اس کی مہک علیؑ
وہ درِّ شاہوار ہدایت ، جھلک علیؑ
حضرت ہیں آفتاب نبوت، چمک علیؑ
یہ حسن ، حسن شاہد قدرت نمک علیؑ
احمدؐ ہیں باکمال تو حیدرؑ کمال ہیں
وہ رخ ہیں اور یہ خالِ رخ بے مثال ہیں

کوثر ملا نبیؐ کو تو حیدرؑ کو سلسبیل
احمدؐ وحی سے ، یہ ہوئے الہام سے جلیل
شاگرد ہیں نبیؐ کے علیؑ ، ان کے جبرئیل
محبوب رب جو دعوۂ حق ہیں تو یہ دلیل

ہے علمِ غیب احمد مرسلؐ کے سہم میں
یہ وارث رسولؐ خدا علم وفہم میں

جہاں تک ایلیاؔ کی سلام نگاری کا سوال ہے تو ایلیاؔ نے سلام کافی تعداد میں کہے ہیں جو ان کے خاندانی بستے کے علاوہ حکیم سید حسن رضا مرحوم کی اہلیہ محترمہ کلثوم فاطمہ مرحومہ کے بستے میں بھی نظر سے گزرے ہیں چونکہ وہ مرحومہ بھی سوز خوانی کرتی تھیں اور چند سلام حکیم میر احمد عرف اچھوؔ کے بستے سے بھی ملے ہیں۔ چند سلاموں کے اشعار ملاحظہ ہو:

سلامی وہ شانِ نبیؐ و علیؑ ہے
جو نور مہہ ومہر سے منجلی ہے
یہ ارشاد احمدؐ برائے علیؑ ہے
میں مولا ہوں جس کا یہ اس کا ولی ہے
ہوئے ہیں جو آمادہ جنگ عباسؑ
پڑی لشکر شام میں کھلبلی ہے
پکاری یہ زینبؑ دہائی ہے بھائی
بہن شام کو قید ہو کر چلی ہے
اٹھارات کو جس کی ماں کا جنازہ
کھلے سر وہ بلوے میں بنت علیؑ ہے
شفیقؔ اس کو کیا خوف نار جہنم
کہ مولا ہمارا خدا کا ولی ہے

حسنؑ ہو یا حسینؑ احمدؐ کی جاں یہ بھی ہے اور وہ بھی
علیؑ کی شان زہراؑ کا نشاں یہ بھی ہے اور وہ بھی

شب ہجرت کوئی رونے میں ہے اور کوئی سونے میں
رفاقت اور وفا کا امتحاں یہ بھی ہے اور وہ بھی
کجا یعقوبؑ کی زاری، کجا سجادؑ کا ماتم
نتیجہ کس کا حسرت ہے فغاں یہ بھی ہے اور وہ بھی
ہے استاد زمانہ خانداں، میر اور مرزا کا
شفیقؔ اپنے لئے اہل زباں یہ بھی ہے اور وہ بھی

راقم کو بھی علامہ شفیق حسن ایلیا کو اپنی کمسنی میں حسینیہ دربار شاہ ولایت میں سننے کا موقع ملا ہے۔ وہ سرتاپا تقدس نظر آتے تھے۔

نصیرؔ کے چوتھے اور سب سے چھوٹے فرزند سید وحید حسن وحیدؔ ہوئے جو گداؔ بھی تخلص کرتے تھے۔ گھر کے ماحول اور بزرگوں سے ملا رگوں میں دوڑنے والے خون نے انھیں شاعر بنا دیا تھا۔ جوانی میں غزل بھی کہی لیکن اس پر زیادہ زور نہیں دیا۔ البتہ رثائی ادب سے زیادہ دلچسپی رہی۔ مردانی مجالس میں پڑھنے کے لیے سلام کہے اور خواتین کی مجالس میں پڑھنے کے لیے خاص طور سے نوحے کہے جو کافی مقبول بھی ہوئے۔

وحیدؔ قومی اور اصلاحی کاموں میں بھی پیش پیش رہتے تھے۔ مثلاً محلے کے تمام معاملات کو بہتر اور خوشگوار بنانے کے لیے اور آپسی بھائی چارہ اور یگانگت قائم رکھنے کے لیے ایک انجمن ''تنظیم محلّہ دربار شاہ ولایت'' امروہہ قائم ہوئی تھی جس کی روداد بھی شائع ہوئی تھی۔ اس کے صفحہ 2 کے مطابق وحیدؔ صدر تھے سید محمد مجتبےٰ میر محلّہ اور سید اکرام حسین نائب میر محلّہ تھے۔ یہ جلسہ 2/اکتوبر 1937ء کو حسینیہ دربار شاہ ولایت میں ہوا تھا۔

وحیدؔ کے نوحہ اس دور میں شائع ہونے والی بیاضوں میں راقم کی نظر سے گذرے ہیں۔ صرف ایک نوحے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

دل تھامے ہوئے دیتی تھی بانو یہ دہائی
کس چاند سے سینے پہ سناں لال نے کھائی
عباسؑ کے مرنے سے کمر ٹوٹ چکی تھی
پھر لاش جواں لال کی کس طرح اٹھائی
زینب کے یہ نالے تھے وحیدؔ جگر افگار
جنگل میں لٹی فاطمہ زہراؑ کی کمائی

اس طرح رثائی ادب میں نصیرؔ کے چاروں بیٹوں کا حصہ رہا ہے۔ ہلالؔ اور ایلیاؔ نے مراثی بھی کہے۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ مشہور ہے کہ ایک بار چاروں بھائیوں نے مل کر ایک مرثیہ کہا اور مقطع میں تخلص ناوشؔ کا استعمال کیا۔ یعنی ن سے نفیسؔ، الف سے انیسؔ، و سے وحیدؔ اور ش سے شفیقؔ۔ ان چاروں حروف کو جوڑ کر ناوش بنایا اور اسے بطور تخلص استعمال کیا۔ یہ مرثیہ خاندانی بستے میں راقم کی نظر سے گزرا تھا لیکن نقل حاصل نہیں کی۔

علامہ شفیق حسن ایلیاؔ کے فرزند اکبر رئیسؔ امروہوی ہوئے۔ آپ کی ولادت کا ذکر ایلیاؔ اس طرح کرتے ہیں کہ ''2 شوال 1322ھ مطابق 12 ستمبر 1914ء سید محمد مہدی کی ولادت ہوئی'' (روزنامچہ ایلیاؔ)

ابتدائی تعلیم دادا اور والد سے حاصل کی اس کے بعد دارالعلوم سید المدارس میں عربی اردو اور فارسی کی تعلیم مکمل کی۔ ایلیاؔ کے روزنامچے کے ہی مطابق 21 نومبر 1921ء کو رسم مکتب (بسم اللہ خوانی) ہوئی اور 30 جون 1934ء کو شادی ہوئی۔

رئیسؔ کی ولادت کے وقت گھر شاعروں سے بھرا ہوا تھا یعنی دادا نصیرؔ، تائے نفیسؔ، ہلالؔ والد ایلیاؔ اور چچا وحیدؔ۔ ظاہر ہے اس ماحول میں تربیت حاصل کی تو خمیر میں علم و حکمت کے نکات اور شعر و ادب کے کتنے اسرار و رموز جذب ہو گئے ہوں گے۔ اسی لیے کم عمری سے ہی شعر کہنا شروع کر دئے تھے اور چونکہ ان کے گھریلو

مکتب کے فارسی کے معلم سید اختر حسن عرفاں تھے۔ اس لیے آپ نے صبا عرفانی لکھنا شروع کیا۔ لیکن جب یہ بات والد ایلیا کے علم میں آئی تو آپ نے منع کیا اور رئیس تخلص تجویز کیا۔

رئیس کا تعلق جس خانوادے سے ہے وہ کسی سند کا محتاج نہیں رہا بلکہ اس خانوادے کی علمی و ادبی خدمات پر تحقیقی کام کر کے دوسروں نے اعلیٰ اسناد حاصل کی ہیں اور اس در پر بڑے بڑے سند یافتہ زانوئے ادب تہہ کرتے دیکھے گئے ہیں۔ ہندوستان کے قیام کے دوران ہی رئیس کے تلامذہ کی ایک طویل فہرست تھی۔ ماہنامہ 'مسافر' مرادآباد کی ادارت کے ذریعے آپ نے ہندوستان میں ایک ممتاز شاعر و صحافی کی حیثیت سے شہرت حاصل کر لی تھی اور پھر ویکلی 'پبلک سروینٹ' امروہہ کے بھی کئی سال مدیر اعلیٰ رہے۔ اسی دور میں انھوں نے یومیہ قطعہ گوئی کی بنیاد ڈالی تھی جو مرادآباد کے روزنامے میں شائع ہوتا تھا اور پھر یہی سلسلہ 1947ء میں روزنامہ 'جنگ' پاکستان پہنچا اور تقریباً 50 سال روزانہ ایک قطعہ تازہ حالات پر تاحیات کہتے رہے اور رئیس کی اس سنت پر ہند و پاک کے اکثر شعرا نے عمل کیا اور آج بھی عمل کر رہے ہیں۔ اس طرح اردو ادب کی تاریخ میں رئیس سے زیادہ قطعات کہنے والا کوئی شاعر نہیں ہوا۔ یہ قطعات سیاسی، سماجی، معاشی، تاریخی، ادبی، علمی، مذہبی، معلوماتی اور رثائی بھی ہیں۔ حقیقتاً وہ شہنشاہ قطعات ہیں۔

رئیس نے 1947ء میں ہندوستان سے ہجرت کی اور کراچی پاکستان پہنچے۔ وہاں بھی صحافت سے پورا تعلق رہا۔ 'جنگ' کے لیے قطعات کے علاوہ کالم بھی لکھے اور ایک خالص ادبی جریدہ ''شیراز'' نام سے ماہنامہ جاری کیا۔ ضمیر اختر نقوی اس سلسلے میں لکھتے ہیں کہ:

''رئیس 1947ء میں کراچی آئے اور صحافت کی دنیا میں چھا گئے۔

پاکستان کے بلند پایہ شعراء میں درجہ امتیاز رکھتے ہیں۔ موجودہ عہد کے پر گو شاعر ہیں۔ انھیں ہر اصناف شاعری پر قدرت حاصل ہے (اردو مرثیہ پاکستان میں، صفحہ 394)۔

رئیسؔ کو واقعی ہر صنف سخن پر قدرت حاصل تھی لیکن قطعہ اور غزل سے ان کا خاص لگاؤ تھا۔ ان کے قطعات 4 جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں اور غزلوں اور نظموں کے بھی 4 مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔

رئیسؔ کی شاعری پر نیاز فتحپوری تحریر فرماتے ہیں کہ:

''رئیسؔ کی شاعری کی بابت یہ کہہ کر خاموش ہو جانا کہ وہ عمومیت و سطحیت سے بلند ہے بڑی پست بات ہے ان کے یہاں تو بات چلتی ہی فراز سے ہے اور ختم ہوتی ہے مدارج علو کے تعین پر۔ جسے تصوف کی زبان میں 'اول ما آخر انتہی' کہتے ہیں۔ یوں تو شاعری نام ہے حسن خیال، حسن فکر و تصور اور حسن شعور و ادراک کا، لیکن اگر ذریعہ ابلاغ و اظہار حسین نہ ہو تو محض فکر و تصور بیکار ہے۔ رئیسؔ کی شاعری میں یہ دونوں باتیں بڑے توازن کے ساتھ پائی جاتی ہیں۔ وہ یقیناً جتنا اچھا سوچتے ہیں اتنا ہی اچھا اسے ظاہر بھی کر سکتے ہیں''۔　　(ماہنامہ نگار کراچی پاکستان)

رئیسؔ کے صرف ایک شعر پر ایک موقع پر جوشؔ ملیح آبادی اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں کہ:

''اگر میرا تمام کلام لے کر رئیسؔ اپنا یہ شعر مجھے دے دیں تو میں اپنے کو قارونِ زماں سمجھنے لگوں'' (روزنامہ جنگ کراچی 21/اپریل 1964ء)

شاید اسے عشق بھی نہ سمجھے
جس کرب میں عقل مبتلا ہے

قطعات کے تاجدار رئیسؔ امروہوی کی قطعہ گوئی کو بھی جوشؔ نے نہ صرف

بہت سراہا ہے بلکہ اس کا لوہا مانا ہے اور انھوں نے کم از کم 18 ہزار قطعات کہے ہیں۔

غزل، نظم اور قطعات کے علاوہ آپ نے نعت، منقبت، رباعی اور قصیدہ بھی کہا ہے اور رثائی ادب میں نہ صرف سلام اور نوحے بلکہ مراثی بھی کہے ہیں جن میں سے ایک بڑا حصہ شائع بھی ہو چکا ہے اور جن کے مطالعے سے احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے تاریخ اسلام، قرآن، احادیث اور تفسیر کا بھی مطالعہ کیا تھا۔

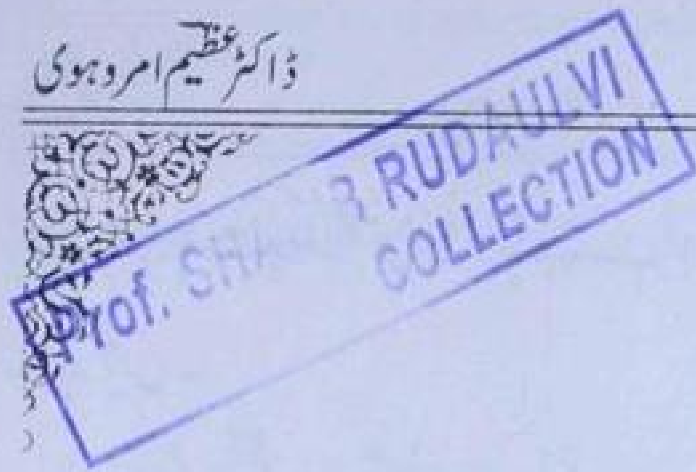
رئیسؔ کی غزلوں کے مجموعے 'الف'، 'پس غبار'، 'ملبوس بہار'۔ نظموں کا مجموعہ 'حکایت نے' منقبتی اور رثائی شاعری میں 'انا منل حسینؑ' اور حسینؑ اور حسینیت، قطعات کے 4 مجموعے طنزیہ ومزاحیہ خاکے 'اچھے مرزا'۔ نفسیات پر 'نفسیات مابعد النفسیات'، 3 جلدیں 'عجائب نفس'، 2 جلدیں 'لے سانس بھی آہستہ'، 2 جلدیں 'مظاہر نفس'، 2 جلدیں 'جنسیات'، 4 جلدیں 'توجیہات'، 2 جلدیں 'مراقبہ'، 2 جلدیں 'حاضرات'، 'جنات'، 'عالم ارواح'، 'المیہ مشرقی پاکستان' اور کلیات رئیسؔ امروہوی منظر عام پر آ چکی ہیں۔

رئیسؔ کے 2 مراثی ان کے مجموعے 'انا منل حسینؑ' میں شامل ہیں۔ پہلا مرثیہ کتابی شکل میں الگ بھی شائع ہوا ہے۔

ع۔ یہ جہاں کتنا پر اسرار جہاں ہے یارب۔ بند 48

ع۔ سجدہ گاہ دردمندانِ جہاں ہے کربلا۔ بند 48

رئیسؔ چونکہ ایک فلسفیانہ مزاج کے بھی مالک تھے اس لیے ان کی دیگر شاعری کی طرح مرثیہ بھی فلسفہ حیات وکائنات کی جھلک لیے ہوئے ہے۔ وہ قدیم وجدید دونوں فلسفوں سے آگاہ ہیں۔ وہ آرائش صحیفہ حیات کے قائل ہیں۔ اور اس پر عمل کرنے کے لیے سیرت امام کا سہارا لیتے ہیں۔ جب وہ کربلا کی جانب نظر اٹھاتے ہیں تو دیکھیے کیا فرماتے ہیں کہ:



قبلۂ اربابِ تسلیم ورضا ہے کربلا
کعبہ لبیک گویانِ وفا ہے کربلا
آزمائش گاہ مردانِ خدا ہے کربلا
شوقِ بے پروا سنبھل یہ کربلا ہے کربلا

جذبۂ آشفتہ سر نے خود سنوارا ہے اسے
عشق نے اپنا لہو دے کر نکھارا ہے اسے

اس کربلا کو عظمت ووقار عطا کرنے والے، تخلیق وتعمیر کرنے والے اور سجانے وسنوارنے والے کے لیے رئیسؔ فرماتے ہیں کہ:

انقلاب فکر کا جو رہنما تھا وہ حسینؑ
جو شعور افروز تسلیم ورضا تھا وہ حسینؑ
جو حدود ابتلا سے ماورا تھا وہ حسینؑ
جو خود اپنی ذات میں اک کربلا تھا وہ حسینؑ

دل کے ہر گوشے میں شمع آرزو جلتی رہی
ذہن میں جس کے ہمیشہ کربلا پلتی رہی

اب یہاں رئیسؔ نے جو ذہن میں کربلا پلنا بتایا ہے یہ بے حد معنی خیز ہے۔ تاریخی پس منظر اور پورا ماضی لیے ہوئے ہے یہ بہت بلیغ مصرع ہے۔

کربلا انسانی طاقت کا نام ہے، کربلا تحریک کا نام ہے، کربلا تہذیب کا نام ہے، کربلا تعمیر کا نام ہے اور کربلا بنی نوعِ انسان کی ترقی کا نام ہے، کربلا زوال سے بچنے کا نام ہے، کربلا تخریب کے رد کا نام ہے اور کربلا تحفظ انسانیت کا نام ہے۔ اس لیے کربلا محدود نہیں بلکہ لامحدود ہے۔ کربلا علاقائی نہیں آفاقی ہے اور کربلا کسی کی میراث نہیں، نسلِ آدمؑ کی جاگیر ہے۔ کربلا ہر جگہ اور ہر وقت موجود ہے۔

ہر انقلاب اس کا دست نگر ہے اور ہر ضرورت پر وہ سامنے آجاتی ہے۔ انسان اور انسانیت کو بچاتی ہے۔ رئیسؔ اپنے مرثیے میں کہتے ہیں کہ:

بھر گیا جب بھی سر باطل میں سودائے فساد
ہوگیا جب بھی شقاوت پر کمربستہ عناد
جب بھی کودا جنگ میں کوئی یزید بدنہاد
جب بھی ابھرا ظلم کی تہہ سے کوئی ابن زیاد
ظلمت تاریخ میں تنہا سفر کرتی رہی
کربلا ہر معرکے میں رفع شر کرتی رہی

کربلا کہاں کہاں کام آئی ایک دوسرے مرثیے میں وہ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

جب بھی دنیا میں ہوئی عہد ستم کی تجدید
حق کی تردید کے درپے ہوئے باطل کے مرید
جب بھی شداد زمانہ کے ہوئے ظلم شدید
جب بھی نازل ہوا امت پہ مزید ایک یزید
جب بھی انساں نے صداقت کا علم لہرایا
بڑھ کے تاریخ نے یہ پرچم غم لہرایا

رئیسؔ نے مرثیے کے چہرے میں فلسفہ حیات و کائنات کو موضوع بنایا ہے اور فلسفہ حیات میں وہ بنیادی چیز غم کو تسلیم کرتے ہیں۔ غم حیات انسانی میں سفر ارتقا کو تیز گامی عطا کرتا ہے۔ حوصلہ دیتا ہے اور عزم کو جواں رکھتا ہے اور وہ مانتے ہیں کہ دل کی جلا غم سے ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

اے خوشا دل کہ ازل سے ہو جراحت خوردہ
جوشش اشک سے اک قریہ دریا بردہ

اے خوشا دل کہ مسرت سے رہے آزردہ
دلِ افسردہ عجب شے ہے دلِ افسردہ

کیا کہیں دل کو جو انعام ملا ہے غم سے
دل سے انساں کی جلا دل کی جلا ہے غم سے

غمِ کائنات میں ایک غم زندہ جاوید بھی ہے۔ اس کے بارے میں فرماتے ہیں کہ:

غم بھی دنیا میں بہت سے، غمِ جاناں، غمِ جاں
کوئی غم دیں کے لیے کوئی برائے دوراں
فکر کے روپ بہت، فکر چنیں فکر چناں
درد کے رنگ کئی، دردِ بشر دردِ جہاں

درد دل ایک ہی ہے، درد جگر ایک ہی ہے
غم ہزاروں، غمِ جاوید مگر ایک ہی ہے

غم سے کتنے ہی مثالاً اثر اندوز ہوں ہم
محو ہو جاتا ہے کچھ دن میں ہر اک نقش الم
غم دوراں کی قسم فطرت انساں کی قسم
غمِ جاوید ہے اک زندہ جاوید کا غم

غم ہے جاوید اسی سے بہ قسم کہتے ہیں
ہائے غم اس کا جسے کشتۂ غم کہتے ہیں

کربلا نے غم کا مفہوم بدل کر اسے جو ابدیت وافادیت اور عظمت عطا کی ہے وہ بھی رئیسؔ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ:

غم کو بخشی نئی صورت نئی سیرت جس نے
کی عطا آنکھ کو اشکوں کی بصیرت جس نے

ڈھال دی درد کے قالب میں مسرت جس نے
عظمت غم کو عطا کی ابدیت جس نے

دل مردہ کو دیا حکم بہر طور تڑپ
روح انساں کو سکھایا کہ تڑپ اور تڑپ

غم شبیرؑ نے ہر عہد کو بخشا وہ شعور
جس کے آگے کبھی چلتا نہیں باطل کا غرور
چشم بینا سے نہیں ہے یہ حقیقت مستور
خود ہے تاریخ کو اس غم کی اشاعت منظور

جب بھی رنگ ستم و جور نکھر جاتا ہے
ایسے عالم میں یہ غم اور نکھر جاتا ہے

کربلا نے نسل انسانی کو تہذیب، اخلاق، تمدن، شرافت، عزت، حمیت، شجاعت، عشق و فا، عزم، حوصلہ، جرأت، ہمت اور شہادت کے کیا کیا درس دئے۔ رئیسؔ کہتے ہیں کہ:

ہم کو اصغر نے بتایا کہ شہادت کیا ہے
ہم کو اکبر نے سکھایا کہ حمیت کیا ہے
ہم نے قاسم سے لیا درس کہ غیرت کیا ہے
ہم نے عباسؑ سے سیکھا کہ شجاعت کیا ہے

جتنے رستے میں اسی منزل مقصد سے ملے
عزم کے درس ہمیں عون و محمد سے ملے

رئیسؔ نے واقعہ کربلا ایک فلسفی کی نظر سے دیکھ کر ایک شاعر کے قلم سے بیان کیا ہے۔
رئیسؔ نے سلام بھی کافی کہے، صرف ایک سلام کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

نازاں ہیں رنگ و بو پہ بہت نودمیدہ پھول
اے قلبِ داغ داغِ دکھا چیدہ چیدہ پھول
خود چن لیے مشیت پروردگار نے
اے کربلا کی خاک ترے برگزیدہ پھول

رئیسؔ امروہوی کی وفات 22 ستمبر 1988ء کو ایک انسانیت دشمن کی دماغ میں گولی لگنے سے کراچی میں ہوئی۔ بقول جونؔ ایلیا بھائی کا قاتل مردم شناس تھا اس نے دماغ پر گولی ماری اور بھائی تھے ہی کیا؟ دماغ ہی دماغ تھے۔

رئیسؔ کے ورثا میں 4 دختران ہیں۔ پسر کوئی نہیں۔ ایک داماد سبط اصغر پاکستان کے مشہور طنز ومزاح نگار اور صحافی ہیں۔ کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔

انیس حسن ہلالؔ کے گھر اس خاندان کی ایک نئی تاریخ لکھنے والے قلم کا جنم 17 جنوری 1917ء کو ہوا۔ دراصل آفتاب کی سیکڑوں گردشوں کے بعد کسی زمین کے حصے میں ایسا دن آتا ہے کہ جب کوئی بے حد باکمال شخصیت پیدا ہوتی ہے۔ انسان کے نام کے اس کی شخصیت پر اثرات کی اگر سب سے اہم مثال دیکھنی ہو اور جس کے کمالات کا سب نے اعتراف کیا ہو، وہ اپنے فن میں کامل و اکمل شخصیت کمالؔ امروہی کی تھی۔

کم سنی سے ہی آنکھوں میں چھپی ہوئی ذہانت جھانکتی تھی۔ چہرے پر فہم وفراست کی چمک نمایاں تھی۔ قلب میں علم وفن کا شوق پوشیدہ اور ایک خاص لگن تھی۔ گفتگو میں رس ہی رس تھا۔ ان کی شکل وصورت سے تغزل چھلکتا تھا۔ بظاہر وہ جتنے خوب رو، پُر کشش اور پُر تاثیر تھے، اتنا ہی خوبصورت فنکار ان کے اندر بیٹھا تھا۔ شعور کی وادیوں میں قدم رکھنے کے بعد تیزی سے ان کی صلاحیتیں سامنے آنے لگی تھیں۔ ان کا طائرِ فکر بلندیوں کی جانب پر کھول کر پرواز کو بے چین تھا۔ ادب گھٹی میں شامل تھا۔ رگوں میں دوڑنے والے خون کے ہر قطرے میں تہذیب کا دریا موجیں مارتا تھا۔ جسم

کارواں رواں تمدن سے آراستہ تھا۔ دل کی دھڑکنیں شعروں میں ڈھلنے لگی تھیں۔ غرض کہ وہ ہر رخ اور ہر اعتبار سے پورے حلقے میں نمایاں تھے۔

وقت گزرتا رہا۔ آگے بڑھتا رہا۔ کمسنی جوانی سے گلے ملنے لگی اور یہ نوجوان وقت سے بھی زیادہ تیزی سے آگے بڑھتا رہا۔ حلقہ احباب میں چچازاد بھائی رئیس امروہوی، خادم حسین خادم، حکیم محمد حامد، تصدق حسین فاضل، مولانا محمد عبادت کلیم، حیات امروہوی، تاباں نقوی اور مصور حسین تجم وغیرہ تھے۔ نوجوانوں کے اس گروپ نے امروہہ کی فضاؤں کو شعر افزا اور ادب نواز بنا دیا تھا۔ ایک عجیب ماحول تھا۔ محفلوں میں شعر، گھروں میں شعر، فضاؤں میں شعر، خلاؤں میں شعر، اور شعر ہی شعر۔

امروہہ سے ضروری تعلیم حاصل کرنے کے بعد اس زمانے کے رائج الوقت اردو فارسی ایم۔ او۔ ایل کے امتحانات لاہور جا کر دئے اور کامیابی حاصل کی اور 1934ء میں لاہور کے ہی اورینٹل کالج سے ایم۔ او۔ ایل کی سند حاصل کی یعنی Master of Oriental Languages اور اب وہ قلم جو شاعری کی راہوں سے گزر رہا تھا۔ صحافت کے ایوان تک پہنچا اور قومی، عوامی، سیاسی یا سماجی صحافت سے بچ کر خالص ادبی صحافت میں شرکت حاصل کی، جو مزاج کے مطابق بھی تھی اور ماہنامہ ''ساقی'' دہلی کی ادارت سنبھالی۔ لیکن یہ سلسلہ بہت کم عرصے رہا۔ پھر بھی انھوں نے اپنے اس پہلے ہی قدم سے ثابت قدمی کا اظہار کر دیا تھا۔ لاہور کے قیام کے دوران ماہنامہ 'تاج' کے مدیر ہو گئے یہ بھی خالص ادبی رسالہ تھا۔ اس طرح 'ساقی' اور 'تاج' دونوں کے ذریعے آپ کی صلاحیتیں سامنے آئیں۔ قلم، نظم و نثر دونوں میں نکھرتا رہا اور ان کی شہرت کے پرندے کے پر بھی تیزی سے بڑھنے لگے۔

جہاں تک کمال امروہی کے شاعری کا تعلق ہے وہ تو 1934ء سے بھی پہلے منظر عام پر آ گئی تھی۔ اور امروہہ سے ہی ان کے دوست حیات امروہوی نے

نومبر 1933ء میں ماہنامہ 'حیات' کا اجراء کیا تھا جس میں ان کی نظم 'تحصیل معرفت' عنوان سے صفحہ 43 پر شائع ہوئی۔ 'حیات' میں اس وقت ان کا نام سید امیر حیدر کمالؔ دیا تھا۔ کمالؔ امروہی کی اس نظم کو ڈاکٹر امام مرتضیٰ نقوی نے اپنے مضمون ''امروہہ کی صحافت کا ایک یادگار رسالہ 'حیات' مطبوعہ ماہنامہ 'رابطہ' دہلی میں غزل مسلسل مانا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ کچھ غزلیں ہیں۔ لیکن ان کو نظموں کا عنوان دیا گیا ہے۔ کلیم نقوی کی 'معارف'، کمالؔ امروہوی کی غزل مسلسل 'تحصیل معرفت' اس دور کے استاد منتظر امروہوی کی 'حقائق' تاباںؔ نقوی کی نظم 'مقدس وقت' نظم کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔''

(رابطہ جنوری 2000ء، صفحہ 7)

ابتدا میں کمالؔ امروہی نے شاعری کے ساتھ ہی نثر نگاری کی راہوں پر بھی اپنے قلم کو ڈال دیا تھا اور ان کا اسپ قلم دونوں میدانوں میں اپنی جولانی دکھانے لگا تھا۔ امروہہ کے 'حیات' میں غزلیں اور نظمیں شائع ہوئیں تو 'الایمان' امروہہ میں مذہبی مضامین نے جگہ پائی۔ لیکن ابدال محمد کے تاریخی دیوان خانے کا یہ قلم کمالؔ امروہی کی انگلیوں کے درمیان رہ کر جب امروہہ سے لاہور ہوتا ہوا ممبئی پہنچا تو نہ جانے کتنے قلم اس کے سامنے سربسجود ہو گئے۔ ہندوستان کے مختلف ادبی رسائل میں ان کی نگارشات نمایاں مقام حاصل کرنے لگیں ان کی ایک غزل جوان کے فرزند تاجدار امروہی سے حاصل ہوئی ہے اس کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

ساز دل، نغمہ جاں، روح فزا ہے، کیا ہے؟
تو کرن ہے، کہ شفق ہے، کہ صبا ہے، کیا ہے؟
پیاس کی آگ بجھا دی ہے تری قربت نے
تو سمندر ہے، کہ دریا ہے، گھٹا ہے، کیا ہے؟

تیری آنکھوں میں کئی رنگ جھلکتے دیکھے
سادگی ہے، کہ جھجک ہے کہ حیا ہے، کیا ہے؟
نام ہونٹوں پہ ترا آئے تو تسکین ملے
راحت جاں ہے، دلاسہ ہے، دعا ہے، کیا ہے؟

ان اشعار کی رنگینی ان کے مزاج کی رنگینی کا پتہ دیتی ہے۔ وہ جمالیاتی اوصاف کے پارکھ بھی تھے اور ان کے قدردان بھی۔ کائنات کی ہر شے میں جمالیات کی تلاش ان کی عمیق النظری کا ثبوت ہے۔ کائنات کے ہر فطری حسن سے وہ متاثر ہوتے تھے۔ کمالؔ امروہی کی ایک اور نظم بھی تاجدارؔ امروہی نے راقم کو دی ہے۔ اس کے صرف دو بند ملاحظہ ہوں۔

جانے تم کون ہو، کون ہو جانے تم
کون اترا ہے زمیں پر چاند سے
سارا عالم خوبصورت ہو گیا
زندگی، تھی جستجو جس خواب کی
تم کو دیکھا تو حقیقت ہو گیا
جانے تم کون ہو، کون ہو جانے تم

گھیرتے ہیں مجھ کو ان دیکھے خیال
چھیڑتی ہیں اجنبی پرچھائیاں
رازِ دل کو لے اڑی بادِ صبا
گفتگو کرنے لگی تنہائیاں
جانے تم کون ہو، کون ہو جانے تم

درحقیقت کمآل اور رئیؔس دونوں ایک ساتھ ہی افق ادب پر ستارہ بن کر سامنے آئے تھے۔ ابتدا میں کمآل شاعر اور رئیؔس نثر نگار تھے۔ لیکن بعد میں دونوں نے اپنے گھرانے کی ان ذمہ داریوں کو بدل لیا اور رئیؔس شاعری کے افق پر چھائے تو کمآل نثر کی دنیا میں زیادہ چمکے اور انھوں نے اسے زیادہ جگمگایا۔ غرض کہ یہ دونوں وارث عطاؔ و سلطاؔن و شایاؔں اور شمعِ کاشانۂ امیرِ حسن امیؔر علم و فن اور شعر و سخن کے آفتاب بن گئے۔

کمآل امروہی کی نثر کی شہرت کا سبب ان کی بہت سی کہانیاں اور مکالمے بنے اور ان کی شہرت وقت سے بھی پہلے جوان ہوگئی۔

نصیؔر کے پوتے اور ہلال کے بیٹے کمآل امروہی کی 'پکار' جب نواب بھوپال نے دیکھی تو معلوم کیا کہ آپ ایسی زبان کیسے لکھ سکے؟ تو آپ نے کہا کہ میں اپنے گھر میں یہی زبان سنتا چلا آیا ہوں۔ میں نے اپنے دادا حضرت نصیؔر امروہوی سے یہی زبان سنی ہے۔

خواجہ احمد عباس نے کمآل امروہی کی ایک کہانی کا انگریزی میں بھی ترجمہ کیا۔ ان کے قلم کے کمالات کا اعتراف سعادت حسین منٹو جیسے ادیب نے بھی کیا۔ اور ان کی زبان کو اعلیٰ اور پرجلال مانا۔ بقول جوؔن ایلیا، وہ اردو ادب کی تاریخ اور تہذیب کے شاہجہاں تھے۔ انھوں نے کئی دربار عام، کئی دربار خاص اور کئی تاج محل تعمیر کیے''۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق اور خواجہ حسن نظامی کمآل امروہی کی 'پکار' سے اتنے متاثر ہوئے کہ اس کے مصنف کا نام جاننا چاہا جب انہیں معلوم ہوا کہ 20 سالہ نوجوان کی یہ تحریر ہے تو بے حد حیرت ہوئی اور 'پکار' کی زبان کی خوب داد دی۔

ادب کے ساتھ ہی کمآل امروہی کو تاریخ سے بھی گہرا لگاؤ تھا۔ تاریخ پر ان کی بھرپور نظر تھی۔ ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کی تاریخ کا انھوں نے خاص طور سے مطالعہ کیا تھا اور تاریخ کے میدان میں ان کا صرف مطالعہ ہی نہیں بلکہ تحقیقی

جائزہ بھی بڑا مکمل تھا۔

انھوں نے کسی عمر میں حافظہ بھی غضب کا پایا تھا۔ فانیؔ کا دیوان تو انھیں پورا حفظ تھا۔ اور غالبؔ و اقبالؔ کے بھی کافی حد تک حافظ تھے۔ ظاہر ہے کہ حافظہ ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا۔ آہستہ آہستہ ان کے حافظے سے بہت کچھ محو ہو گیا تھا۔ کیونکہ عمر جتنی جتنی بڑھتی ہے حافظہ اتنا اتنا گھٹتا ہے۔

بہر حال امیر حسن امیرؔ اور نصیر حسن نصیرؔ کا یہ پوتہ امیر مملکت ادب نصیر سلطنت شعر و سخن، شہر یار خطہ فن اور تاجدار اقلیم کمال و جمال، ہلالؔ امروہوی کا نونہال بدر کامل بن کر 11 فروری 1993ء کو افق ممبئی سے اتر کر ساحل سمندر پر غروب ہو گیا۔ کمال و فن کا جنازہ اٹھ گیا۔ شہرتوں کا آفتاب غروب ہو گیا۔ لاکھوں آنکھیں بھیگ گئیں۔ انگنت کراہیں دلوں سے اٹھ کر خلا میں بکھر گئیں اور اس خانوادے کی سنہری تاریخ کا ایک باب بند ہو گیا۔ ان کی موت پر علمی، ادبی، فلمی، سیاسی، سماجی اور قومی شخصیات نے اظہار افسوس کیا۔ شعراء نے تعزیتی نظمیں کہیں۔ جگہ جگہ تعزیتی جلسے ہوئے۔ ان کی موت پر جونؔ ایلیا نے ایک مکمل شخصی مرثیہ کہا۔ راقم نے بھی دو نظمیں کہیں جو ان کے چہلم کی مجالس میں پیش کیں۔ جونؔ ایلیا نے مرثیے کا آغاز ترکیب بند میں اس طرح کیا ہے۔

جس کی ہر بات ہو کمال کی بات
کیا کہوں ایسے بے مثال کی بات

شہرت عام کی تمناؤ! اس کی خدمت میں آ کے بس جاؤ
حسن کا گلستاں طراز ہے یہ اس کے قدموں پہ پھول برساؤ
کبھی یہ شخص مر نہیں سکتا ہے یہ زندہ اسے نہ دفناؤ

یہ جو ہے لاجواب ہے یہ شخص
ہے حقیقت کہ خواب ہے یہ شخص

آگے جونؔ کہتے ہیں کہ:

آپ کو کیسی نیند آئی ہے　　یہ تو ہم سب سے بے وفائی ہے
رنگ نے لی ہے آخری ہچکی　　حسنِ فن نے شکست کھائی ہے
دل نے دھڑکن کا ساتھ چھوڑا ہے　　شمع نے روشنی گنوائی ہے
سرنگوں ہوگئی ہے اک تاریخ　　ایک تہذیب لڑکھڑائی ہے
ہونے والا ہے آخری دیدار
با ادب، با ملاحظہ ہشیار
لفظ و معنی کا شہر یار کمالؔ　　اور پھر کیسا شاندار، کمالؔ
ہے یہی گونج فن کی دنیا میں　　فن کی دنیا کا تاجدار، کمالؔ
عظمتوں کی عظیم تر عظمت　　یادگاروں کی یادگار، کمالؔ
گلشن حسن لہجہ اردو!　　تھا تری آخری بہار، کمالؔ
وہ جلال و جمال طرز بیاں　　ہو فدا جس پہ بار بار کمالؔ
سوگ میں ہے جلال کی گفتار
تر بہ تر ہیں جمال کے رخسار

جونؔ ایلیا نے ایک مخصوص اور جدید اسلوب میں یہ مرثیہ کہا ہے۔ کمالؔ امروہی کی صفات وخصوصیات، علم، فن، زباں دانی وخوش بیانی کا ذکر کرنے کے بعد رثائی لہجہ اختیار کیا ہے اور ایسے ہی مضامین بیان کیے ہیں۔ اسے ہم ایک منفرد جدید شخصی مرثیہ کہہ سکتے ہیں۔

جہاں تک کمالؔ امروہی کی رثائی ادب میں خدمات کا سوال ہے تو وہ اس ادب سے بہت متاثر تھے اور انھوں نے اس کے مطالعے کا آغاز ابتدائی عمر سے ہی کر دیا تھا۔ ایک موقع پر راقم نے جب ان سے یہ سوال کیا کہ آپ کے گھرانے میں صدیوں سے رثائی ادب کی خدمت ہو رہی ہے آپ کے امروہہ کے

تمام احباب رئیس، حیات، خادم، کلیم، فاضل، تاباں اور نجم سب نے ہی مرثیہ، سلام اور نوحے میں کچھ نہ کچھ ضرور کہا ہے۔ لیکن آپ نے کچھ نہیں کہا؟ تو فرمانے لگے کہ ایسا نہیں ہے۔ میں نے مذہبی مضامین بھی لکھے ہیں اور امام حسینؑ کے بارے میں اشعار بھی کہے ہیں۔ کربلا کے المیے سے تو غیر متاثر ہوئے ہیں اور انھوں نے بہت کچھ کہا ہے۔ لیکن میں نے پوری توجہ کے ساتھ باضابطہ اور باقاعدہ طور پر نہیں کہا اور جو کچھ کہا وہ 30-25 سال کی عمر تک۔ اس کے بعد بالکل موقع ہی نہیں ملا۔ اور وہ سب کچھ محفوظ نہیں رکھ سکا۔ کہیں پرانے کاغذات میں شاید کچھ مل جائے۔ یہ گفتگو ان سے میری 1975ء سے 1980ء کے دوران ہوئی تھی جب میں 'مرثیہ نگارانِ امروہہ' عنوان سے تحقیقی کام کر رہا تھا اور جو میری کتاب 1980ء میں 575 صفحات پر مشتمل پاکستان سے شائع ہوئی اور جس کا سرورق عالمی شہرت کے مصور وخطاط صادقین امروہوی نے بنایا تھا۔

جب میں نے ان سے یہ درخواست کی کہ اگر کچھ یاد ہو تو سنایئے تو انھوں نے دو تین شعر سنائے۔ لیکن یہ میری غفلت کہ میں نے نوٹ نہیں کئے اور ظاہر ہے کہ آج سے تقریباً 35 سال قبل سنے ہوئے شعر کیسے یاد رہتے۔ ایک شعر میں نے کہیں نوٹ کر لیا تھا وہ یہ ہے کہ

خدا کے دین کو جب تشنہ لب نہ دیکھ سکا
حسینؑ صبر کا دریا بہا دیا تو نے

بہر حال انھیں عزاداری شہدائے کربلا سے بے حد دلچسپی تھی اور تاحیات پابندی سے عشرہ محرم میں امروہہ تشریف لاتے رہے۔ دن میں جلوس عزا میں شرکت کرتے تھے اور شب میں مجالس میں شریک ہوتے تھے۔ مرثیہ وسلام پوری توجہ سے سنتے تھے اور محظوظ ہوتے تھے۔ محرم کے دس دنوں میں وہ فلمی دنیا کے ڈائرکٹر

اعظم، یا نامور رائٹر کمال امروہی نہیں رہتے تھے بلکہ بھائی چندن، چچا چندن، ماموں چندن ہو جاتے تھے۔ ان کا گھر کا نام چندن تھا اور تمام عزیز اسی نام سے مخاطب کرتے تھے۔ وہ چندن آج سیکڑوں من مٹی کے نیچے ہے لیکن اس کی خوشبو اور اس کی مہک باقی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا نام ان کے وطن کی شہرت کا سب سے بڑا ذریعہ بنا۔ جس طرح شیخ سعدی شیرازیؒ نے شیراز، خواجہ معین الدین چشتیؒ نے چشت اور آیت اللہ خمینیؒ نے خمین کو شہرت بخشی اسی طرح کمال امروہی نے امروہہ کی پہچان کرائی۔

وہ شخص لاجواب تھا، وہ شخص بے مثال تھا
وہ آدمی حقیقتاً کمال ہی کمال تھا

اس خاندان کے علمی، ادبی اور خصوصاً شاعرانہ ماحول میں شادی ہو کر آنے والی خواتین پر بھی خاندان کا اثر پڑا ہے۔ سید امیر حیدر کمال امروہی کی ادبی زندگی کا آغاز ہی شاعری سے ہوا تھا کیونکہ انھوں نے نثر کے میدان میں بعد میں قدم رکھے۔ پہلے تو وہ شاعری کی وادیوں میں ہی داخل ہوئے تھے۔

کمال امروہی کی ادبی زندگی میں شریک ہو کر جو شریک زندگی بن جائے کیسے ممکن تھا کہ وہ شاعرنہ ہو۔ کمال امروہی تو نثر میں بھی شاعری کے ہنر سے واقف تھے۔ مزاج شاعرانہ، فکر شاعرانہ، تخیل شاعرانہ، لب ولہجہ شاعرانہ، مکمل گفتگو شاعرانہ۔ وہ سراپا تغزل تھے اور ان کی شکل وصورت قدرت کی فیاضی اور سخاوت کا ثبوت تھی۔

ان کی زندگی میں ان کی شریک حیات ہونے کے بعد مہ جبیں (مینا کماری) کیسے شاعرہ نہ بنتیں وہ تو کمال امروہی کی ذات میں اتنی داخل ہو چکی تھیں کہ خود کو ضم کر لیا تھا۔

بہر حال اسی قربت نے مینا کماری کا مزاج بدل دیا اور آہستہ آہستہ شعر کہنے پر آمادہ ہو گئیں۔ یعنی وہ گھر میں مہہ جبیں تھیں۔ فلم میں مینا کماری ہو گئیں اور

ادب میں نازؔ اور کہیں میناؔ کہلائیں۔ بچپن میں ان کے والد میوزک ڈائرکٹر علی بخش نے ناز اٹھائے تو جوانی میں جب بہو بن کر شوہر کے گھر آئیں تو وہاں صرف مینا بن کر نہ رہیں بلکہ وہ قابل ناز بھی بن گئیں۔

جب نازؔ نے شعر کہے تو ظاہر ہے کہ سب سے پہلے شریک حیات کو سنائے۔ کمالؔ امروہی نہ صرف شاعر و ادیب تھے بلکہ بڑے نکتہ رس اور نکتہ سنج بھی تھے ان کی نظر گہری تھی۔ ان کے مشوروں سے نازؔ کے کلام میں نکھار آیا۔ اس کے علاوہ نازؔ نے کبھی کبھی کیفیؔ اعظمی سے بھی مشورہ لیا۔ دراصل کمالؔ امروہی اور کیفیؔ اعظمی میں کافی قربت تھی۔ اس قربت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نازؔ نے کیفیؔ اعظمی سے بھی مشورہ لیا۔ اب کیسے ممکن تھا کہ نازؔ ایک طرف رثائی ادب کے اتنے بڑے خانوادے کی بہو ہوں اور دوسری طرف اس کیفیؔ اعظمی سے بھی مشورہ سخن کریں جس نے ابتدائی دور میں ہی کافی کربلائی نظمیں کہی ہوں اور وہ خود اس موضوع پر کوئی شعر نہ کہیں۔

ویسے نازؔ کی دیگر شاعری کا مجموعہ 'تنہا چاند' عنوان سے منظر عام پر آچکا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ کلام 'مینا کماری کی شاعری' کے عنوان سے کتاب والا پبلی کیشن دہلی نے بھی شائع کیا ہے۔

بحیثیت اداکارہ بھی وہ یادگار المیہ کردار ادا کرنے والی اداکارہ تھیں۔

نازؔ کے اندر ایک چھپا ہوا فطری رنج و ملال تھا۔ ان کے اندر غم بیٹھا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ اداسی ان کا فیشن تھا۔ ایک شعر ملاحظہ ہو۔

اداسیوں نے مری آتما کو گھیرا ہے
روپہلی چاندنی ہے اور گھپ اندھیرا ہے
خدا کے واسطے غم کو بھی تم نہ بہکاؤ
اسے تو رہنے دو میرا، یہی تو میرا ہے

نازؔ کی یہ غم پسندی ہی انھیں کربلا تک لے گئی اور متفرق اشعار کے علاوہ انھوں نے ایک مکمل سلام بھی کہا جسے حیدر آباد کے قدیم اور مقبول ہفت روزہ 'بانگ درا' نے شائع بھی کیا۔ سلام بے حد مرصع اور ایک مخصوص لہجہ لیے ہوئے ہے۔ سلام پڑھ کر شاعرہ کی پختہ کاری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

سلام

عباسؑ کا وہ غیظ وہ تیور جلال کے
خود موت رکھ رہی ہے قدم دیکھ بھال کے

اصغر کو مانگا شہ نے کلیجہ سنبھال کے
ہاتھوں پہ ماں نے رکھ دیا دل کو نکال کے

اصغر گئے نہ جھولے سے بانو کے بین تھے
سینے سے لے گیا ہے کوئی دل نکال کے

انساں کے دل کا وزن کیا تھا حسینؑ نے
میزان موت میں علی اصغر کو ڈال کے

بتلا رہی ہے شام غریباں کی بے کسی
گیسو بکھر گئے ہیں محمدؐ کی آل کے

پیشانی نیاز جھکادی حسینؑ نے
مینا یزید نحس کو دوزخ میں ڈال کے

اس سلام پر مہہ جبیں مرحومہ المعروف مینا کماری مینا دیا ہوا ہے۔ (ہفتہ روزہ 'بانگ درا' اربعین نمبر حیدرآباد، 7 مئی 2002ء، صفحہ 30)

علامہ شفیق حسن ایلیا کے دوسرے فرزند سید محمد تقی تھے جن کی ولادت 12 مئی 1917ء کو امروہہ میں ہوئی۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ پھر سید المدارس امروہہ میں عربی، فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد الہ آباد بورڈ سے امتحانات دئے اور پھر عربک کالج دہلی سے ایم اے کی سند حاصل کی۔ اس کے علاوہ اورینٹل کالج لاہور سے مولوی، فاضل کا امتحان پاس کیا۔ 1948ء میں پاکستان ہجرت کی اور کراچی میں سکونت اختیار کی۔ سیاسی شعور نوجوانی میں ہی بیدار تھا اور ایک خاص قومی جذبے کے مالک تھے۔ نظریاتی ساتھیوں میں پروفیسر ممتاز احمد نقوی اور قائم امروہوی وغیرہ تھے۔

سید محمد تقی نے طالب علمی کے زمانے سے ہی لکھنا شروع کردیا تھا۔ میرٹھ میں ساغر نظامی کے ساتھ مل کر ایک ماہنامہ 'ایشیا' نام سے بھی جاری کیا اور جب دہلی آگئے تو 'شمع' رسالے کا اجراء ہوا تو اس کے پہلے مدیر ہوئے اور شمع کو کافی ترقی دی۔ بعد میں 'شمع' ہندوستان کا سب سے مشہور فلمی رسالہ بن گیا۔ فلموں پر تبصرے لکھنے کے بانی بھی سید محمد تقی صدر ہی تھے۔ اس سے پہلے فلموں پر تبصرہ لکھنے کا رواج نہیں تھا۔

پاکستان پہنچنے کے بعد محمد تقی کا ملک کے نامور صحافیوں میں شمار ہونے لگا اور ایک وقت وہ بھی آیا کہ آپ صف اول کے صحافی ہوگئے اور اس وقت کے دنیا کے سب سے بڑے اور کثیر الاشاعت اخبار روزنامہ ''جنگ'' کے چیف ایڈیٹر ہوگئے اور ان کے اداریے اردو کے دوسرے اخبارات اکثر نقل کرنے لگے۔

افسانہ نگار اور صحافی کے علاوہ محمد تقی صدر کی ایک حیثیت اور بھی بہت اہم تھی۔ یعنی وہ ایک عظیم فلسفی تھے۔ فلسفے پر ان کی تصانیف عالمی شہرت کی مالک ہیں۔ جن کا ترجمہ دیگر زبانوں میں بھی ہوا ہے۔ ان کی مندرجہ ذیل تصانیف بہت مشہور ہوئیں مثلاً 'نہج البلاغہ کا تصور الوہیت'، 'روح فلسفہ اور سائنس'، 'تاریخ اور کائنات میرا نظریہ'، 'روح فلسفہ'، 'ہندوستان پس منظر اور پیش منظر'، 'منطق فلسفہ اور سائنس'، 'ایسیز آن فلاسفی' (انگریزی)، 'نیو کنسیپٹ آف دی یونیورس' (انگریزی) وغیرہ آپ کے تراجم میں سر جم کی مشہور کتاب 'Mysterious Universe' کا اردو ترجمہ 'پراسرار کائنات'، وہائٹ ہیڈ کی کتاب Aims of Education کا ترجمہ 'مقاصد تعلیم'، جون ڈوئی کی کتاب کا ترجمہ 'جمہوریت اور تعلیم' کے عنوانات سے بہت مشہور ہوئے اور عالمی شہرت حاصل کی۔

احمد حسین صدیقی محمد تقی صدر کے بارے میں اپنی کتاب، 'دبستانوں کا دبستان' میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

''وہ برصغیر کے ممتاز صحافی، دانشور، تبصرہ نگار اور بڑے مشہور فلسفی تھے۔ محمد تقی کا شمار ملک کے نامور صحافیوں میں ہوتا تھا۔ وہ ایک بہت بڑے فلسفی بھی تھے۔ ان کی فلسفیانہ زندگی کا ذکر کرتے ہوئے غازی صلاح الدین نے کہا: 'سید محمد تقی ایک غیر معمولی انسان تھے۔ انھوں نے انسان دوستی کو ہمیشہ مقدم رکھا۔ وہ تمام زندگی علم و ادب کے فروغ کے لیے کوشاں رہے۔ ہر زندہ معاشرے میں فلسفے کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ لیکن ہمارے ہاں یہ صورت نہیں ہے ہمیں اس کا اعتراف ہے کہ ہم نے سید محمد تقی کی فلسفیانہ فکر سے خاطر خواہ فائدہ حاصل نہیں کیا۔''

(دبستانوں کا دبستاں، کراچی، حصہ اول، صفحہ 412-413)

جہاں تک صدر کی شاعری کا تعلق ہے تو وہ شاعر صدر جو جوانی میں تھے

آگے آنے والے وقت میں آہستہ آہستہ شاعر صدر نہ رہ کر مشاعروں، اجلاسوں کانفرنسوں، مذاکروں، سمپوزیم اور سمیناروں کے صدر ہو گئے۔ شاعری کی تاریخ پر نظر رکھی۔ شاعری کی تنقید اور شاعری پر تبصرہ کیا لیکن شاعری کی تخلیق ختم ہوگئی۔ حقیقت یہ ہے کہ شاعری تو انھوں نے گھر کے ماحول کی وجہ سے کی لیکن وہ ایک فلسفی کا دماغ اور ایک صحافی کا دل لے کر پیدا ہوئے تھے۔ یہ دونوں ان کے اندر آخری عمر تک جاگتے رہے۔

صدر نے 1982ء میں جب راقم پاکستان کے عالمی مشاعرے میں شرکت کے لیے گیا تھا تو چند کتابیں بطور تحفہ دی تھیں جن میں "تاریخ اور کائنات میرا نظریہ" بھی تھی۔ یہ کتاب امیر العلما مولانا سید حمید الحسن صاحب قبلہ پرنسپل ناظمیہ عربک کالج لکھنؤ کے مطالعے میں آچکی تھی۔ اس وقت مجھے مولانا کا ایک جملہ یاد آرہا ہے۔ وہ مجھ سے فرمانے لگے کہ یہ کتاب ایسی ہے کہ ایک پیراگراف پڑھ کر سینے پر رکھ لی جائے اور کچھ دیر غور و خوض میں ڈوبے رہیں تب اگلا پیراگراف پڑھیں۔

بہر حال جہاں تک صدر کی شاعری کا تعلق ہے ان کی غزل تو کوئی نہیں ملتی۔ لیکن گھر کے ماحول نے جو مذہبی شاعری کا رجحان پیدا کیا تھا۔ اس کے نمونے ملتے ہیں ایک سلام کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہم ہیں اس فخر مسیحا کے طلبگاروں میں
جس کے خود شافی مطلق بھی ہیں بیماروں میں

دیکھ کر شان علیؑ طور سے موسیٰؑ بولے
ہم بھی ہیں قوم نصیری کے طلبگاروں میں

مدحت حیدر کرارؑ میں کہتا ہوں جو شعر
بلبلیں ان کو لیے پھرتی ہیں منقاروں میں

جس کو خالق نے پیمبرؐ کا دیا حسن ملیح
ہیں ملیحان جہاں اس کے نمک خواروں میں

دیکھ کر روئے علی یوسفؑ کنعاں نے کہا
حسن یہ فرد ہے عالم کے طرحداروں میں

اس کی اک ضرب پہ عالم کی عبادت ہے نثار
شورِ تکبیر تھا جس تیغ کی جھنکاروں میں

پار بیڑا کیا شبیرؑ نے پیاسے رہ کر
کشتی دین محمدؐ تھی جو منجھداروں میں

جام پر جام اڑاتے ہیں جہاں پر جبریل
صدرؔ، میں صدر ہوں اس بزم کے میخواروں میں

مندرجہ بالا اشعار ہر چند کہ صدرؔ کی جوانی کے ہیں لیکن ان میں پختگی ہے اور یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ ان میں منقبتی اور رثائی شاعری کی بھی بھرپور صلاحیت تھی ان کا قلم اگر اس میدان میں بھی جاری رہتا تو یقیناً کامیاب ہوتے اور ایک شاعر کی حیثیت سے بھی ممتاز مقام حاصل کرتے۔

خاندان کمالؔ امروہی میں ایک نئی فکر، نیا لہجہ، نیا آہنگ، نیا اسلوب اور ایک نئی نہج کے ساتھ ساتھ ایک نیا مزاج لے کر پیدا ہونے والے کا نام جونؔ ایلیا ہے۔ کمسنی سے ہی شعر کہنے شروع کر دئے تھے۔ مطالعے کا یہ عالم کہ گھر سے باہر کبھی سگریٹ خریدنے کو بھی نکلے تو ہاتھ میں کتاب کھلی ہوئی اور نظریں اس پر جمی ہوئی۔ اب چاہے سڑک پر کچھ بھی ہو انھیں کچھ خبر نہیں رہتی تھی۔ راقم کی اس وقت کم سنی تھی لیکن یہ سب کچھ اس وقت مشاہدے میں رہا ہے۔

جونؔ ایلیا کے والد علامہ شفیق حسن ایلیاؔ کا آخری دور تھا۔ گھر میں ایک طرف ان کے ملنے والے اور تلامذہ آتے تھے تو دوسری جانب جونؔ ایلیا کے شاگرد جمع رہتے تھے۔ یعنی عنبرؔ امروہوی، جالبؔ امروہوی اور رضا امروہوی وغیرہ وغیرہ آپ سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ اس طرح آپ نے اپنے والد سے اسی عمر میں اتنا سیکھ لیا تھا کہ استادی کے درجے پر فائز ہو گئے تھے۔

جونؔ کے شعر کہنے کا یہ حال تھا کہ اس دور میں امروہہ میں ہونے والی زیادہ تر محافل کی نظامت کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ جو شاعر اپنا کلام پڑھ کر ہٹتا تھا اس کی ہی زمین میں فی البدیہہ شعر کہہ کر اگلے شاعر کو دعوت سخن دیتے تھے۔ شعر تیز کہنے کا یہ حال تھا کہ اکثر ایسا بھی ہوا کہ محلے میں کسی کی شادی ہوئی تو اس سے پہلے گانا گانے والی لڑکیوں نے گیت کی فرمائش کر دی۔ آپ نے اسی وقت گیت کہہ کر دے دیا۔ اس وقت تک ان کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ جب ان سے شادی کو کہا گیا تو انھوں نے ایک گیت شادی کی مخالفت میں کہہ دیا۔ مطلع ہے

کبھی اے جونؔ تم شادی نہ کرنا
خیالِ خانہ بربادی نہ کرنا

والدہ کا انتقال ہو گیا تو تائے نفیس حسن نفیسؔ کی اہلیہ حیات تھیں۔ ان سے

قربت بڑھ گئی۔ انھیں جونؔ بھو اماں کہتے تھے۔ پھر شادی اور رشتے کا ذکر ہوا تو ایک گانا پہلے گانے سے بالکل مختلف کہہ دیا۔ اس کا مطلع ہے۔

تڑپتی ہیں بھو اماں مری نسبت نہیں ہوتی
ہمارے شہر میں شاعر کی کچھ عزت نہیں ہوتی

جونؔ بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔ حالانکہ انھوں نے نظمیں بی کہیں لیکن مزاج غزل کا پایا تھا۔ ویسے انھوں نے نثر بھی لکھی ڈائجسٹ اور جرائد کے اداریے بھی لکھے لیکن غزل سب پر حاوی تھی۔ وہ شاعر تھے۔ اور گلے گلے اس میں غرق تھے اور سرتاپا شاعر تھے۔ ان کے اندر کا شاعر شاید اس وقت بھی نہیں سوتا تھا جب وہ سو جاتے تھے۔ جوانی میں نہ جانے کتنی منقبتیں کہیں جو امروہہ میں بہت مقبول بھی ہوئیں۔ ایسی ہی ایک منقبت کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

پشتِ رسولؐ پاک پر جلوہ نما امام دو
مرکب خوش خرام ایک، راکبِ لالہ فام دو

ذات محمدؐ و علیؑ اصل ہے ایک نام دو
میکدہ وجود میں بادہ ہے ایک جام دو

سرخیِ عارضِ چمن، شوخیِ غازۂ شفق
خوب لئے حسینؑ نے خونِ جگر سے کام دو

ذکرِ غدیر و کربلا حاصلِ عشرت و عزا
بزمِ سخن کی جان ہیں اصل میں یہ کلام دو

(پندرہ روزہ ُحدیث دل'، دہلی، صفحہ 3)

امام زین العابدینؑ کی مدح میں ایک نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

نادم ہو نہ کیوں عابدؑ دلگیر سے زنجیر
ہے زحمت پا گردشِ تقدیر سے زنجیر
ساقوں پہ جو ہیں نقش تو ہیں نیل گلو میں
ہے طوق سے اک طوق تو زنجیر سے زنجیر
بیمار کو ہوتی ہے جو رفتار سے زحمت
اٹھتی ہے اسی فکر میں تاخیر سے زنجیر

('بیمار مسیحا' مرتبہ عنؔبر امروہوی، صفحہ 7)

جونؔ ایلیا انتقال سے چند سال پہلے جب ہندوستان آئے تھے تو امروہہ میں 'حسینؑ ڈے' (منقبتی مشاعرہ) میں شرکت فرمائی تھی اور منقبت پیش کی تھی۔

جونؔ ایلیا نے جب منقبت کہنی کم کردی تب بھی ان کی غزلوں میں ان کی منقبتی اور رثائی فکر سامنے آتی رہی۔ مثلاً ایک غزل میں کہتے ہیں کہ:

آج بھی تشنگی کی قسمت میں — سمِ قاتل ہے سلسبیل نہیں
اے عزادارو! کرو مجلس بپا — آدمی انسان کو مار آئے تو

رثائی ادب کی اہم ترین صنف نوحہ ہے۔ کیونکہ مرثیے اور سلام میں مدح وثنا کے اشعار بھی ہوتے ہیں۔ لیکن نوحہ خالص رثائی صنف ہے۔ جونؔ نے ہندوستان کے ہی قیام کے دوران نوحے بھی کافی کہے۔ جسے امروہہ کی انجمنوں نے بھی پڑھا۔ "انجمن جاں نثارانِ حسینؑ" بھی آپ کا کلام پڑھتی تھی۔ اسی دور میں آپ کا ایک نوحہ بے حد مقبول ہوا جس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

بلا کے غم اٹھائے جا رہے ہیں جفا کے تیر کھائے جا رہے ہیں
ورق قرآنِ ناطق کے غضب ہے پریشاں رن میں پائے جا رہے ہیں
فدا کرنے کو دینِ مصطفیٰؐ پر علی اکبر سجائے جا رہے ہیں
علی اصغر تبسم میں تمہارے گلے اُمت کے پائے جا رہے ہیں
قدم دوش نبوت پر تھے جن کے وہ کانٹوں پر پھرائے جا رہے ہیں
بٹھاتے تھے نبیؐ کاندھوں پہ جن کو وہ نیزوں سے گرائے جا رہے ہیں
وہ جس کا جسم ہے جسمِ رسالت اسے دُرّے لگائے جا رہے ہیں
ہوا تھا جون قائم جن سے پردہ وہ بازاروں میں لائے جا رہے ہیں

جہاں تک جون ایلیا کی مرثیہ نگاری کا تعلق ہے تو انھوں نے کربلائی مرثیہ تو کوئی نہیں کہا۔ البتہ شخصی مراثی ضرور کہے۔ جن میں پہلا مرثیہ امروہہ کے نامور طبیب حکیم سید میر احمد مرحوم عرف اچھو کے انتقال پر کہا۔ جن کی وفات 28 اکتوبر 1956ء کو امروہہ میں ہی ہوئی تھی۔ یہ مرثیہ خاصہ طویل ہے لیکن مسدس کی form میں نہیں ہے اور ایک بہت بڑے فریم میں کتابت ہو کر حکیم صاحب موصوف کے گھر میں آویزاں ہے جو راقم کو ان کے نواسے سید عادل ظفر سلمہ سے حاصل ہوا ہے۔ مرثیے کا آغاز جون اس طرح کرتے ہیں:

اعتبار حیات کچھ بھی نہیں کچھ نہیں کائنات کچھ بھی نہیں
سحر و شام، عشرت و آلام صرف باتیں ہیں، بات کچھ بھی نہیں
ایک شعلہ ہے دن، بس اک شعلہ اک دھنواں ہے یہ رات کچھ بھی نہیں
وہم ہے ربطِ جسم و جاں اک وہم زندگی کی برات کچھ بھی نہیں
چارہ گر ختم ہوں جئیں بیمار
کچھ نہیں صحت و مرض پہ مدار

مرثیے کے چہرے کے ان اشعار میں بے ثباتی عالم اور ناپائیداری دنیا کا جس فلسفیانہ انداز میں بیان کیا ہے وہ جون ایلیا کے مفکرانہ ذہن کا عکاس ہے۔ آگے اسی موضوع کو گریز سے ہمکنار کرتے ہیں اور پھر اپنے اصل مقصد کی جانب بڑھتے نظر آتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

قصرِ انفاس اتنا بے بنیاد خانہ مرگ زندگی برباد
اک تخیل ہے کائنات جہاں اک تمسخر ہے عالم ایجاد
کیسے لوگ اور ان پہ یہ آفت کیسے دل اور ان پہ یہ افتاد
کیسے شاداب پھول کمہلائے کیسا آباد گھر ہوا برباد
سوگواروں کی زیست کا مقصد صرف اک یاد اور کیسی یاد
دل برباد عمر بھر آہیں لب فریاد عمر بھر فریاد
آج ہر دل کی آس ٹوٹ گئی
خود مسیحا کی نبض چھوٹ گئی

اس کے بعد جون ایلیا ایک خاص علامتی انداز میں موت سے شکوہ بہ لب ہیں۔ اس شکوے میں غم والم اور رنج وملال پنہاں کر کے رثائی ماحول، بکائی کیفیت اور مرثیائی فضا پیدا کی ہے۔ کہتے ہیں کہ

کس کا لوٹا ہے کارواں تو نے کیا کیا مرگ ناگہاں تو نے
وقت کے دل پسند نغموں کو کردیا نالہ وفغاں تو نے
چھین کر ایک جانِ شیریں کو تلخ کردی ہے داستاں تو نے
ناز پروردگانِ دولت کو کردیا آج بے اماں تو نے
تف ہے اے آسماں ترے اوپر توڑ ڈالا ہے ساز جاں تو نے
کیا بتاؤں کہ کتنی آنکھوں کو کردیا آج خوں فشاں تو نے

آفتاب جہانِ حکمت کو اے فلک کھو دیا کہاں تو نے

یہ خبر اُف یہ حشر خیز صدا

اس خبر کا یقیں نہیں آتا

مرثیہ جیسے جیسے آگے بڑھتا ہے ویسے ویسے رنج وغم کے ماحول میں اضافہ ہوتا ہے اور لہجے کی غم زدگی بڑھتی رہتی ہے جون ایلیا فرماتے ہیں کہ

خود مسیحا اجل سے ہار گیا زندگی تیرا اعتبار گیا

موت بھی ہاتھ مل رہی ہوگی ایسی کچھ زندگی گزار گیا

آج اسباب فن ہوئے برباد آج قانون کا وقار گیا

دردمندانِ غم کہاں جائیں جب مسیحائے روزگار گیا

آہ دارالشفا کی ویرانی آج اس گھر کا برگ وبار گیا

کیا گزرتی ہے آج اس گھر میں جو بھی آیا وہ اشکبار گیا

ہوگئی بارگاہِ طب ویراں

آخری بار لٹ گیا یوناں

اس کے بعد حکیم میر احمد مرحوم کے اوصاف بیان کیے ہیں اور موت کے وقت گھر کے سوگوار ماحول کی منظر کشی کی ہے۔ مرثیہ کافی طویل ہے صرف چند بیتیں ملاحظہ ہوں۔

تو نہیں اے طبیب لاثانی

مرگئے بو علی و گیلانی

کیا کہیں کچھ نہیں ہے کہنے کو

ہائے کیا غم ملا ہے سہنے کو

نکہت گلشن وقار گئی

کتنی یادوں کی یادگار گئی

ان کی عظمت کا کچھ حساب نہ تھا
شہر کیا دور تک جواب نہ تھا
ان کی ہر بات یاد آتی ہے
روح سینے میں تھرتھراتی ہے
غم سے فریاد کرکے روئیں گے
ہم انھیں یاد کر کے روئیں گے

جونؔ ایلیا کا وہ مرثیہ جو انھوں نے اپنے چچازاد بھائی کمالؔ امروہی کی رحلت پر کہا ہے وہ بھی اسی بحر اور اسی Form میں ہے۔ جس میں انھوں نے خاندان کے تمام بزرگوں کا ذکر بڑے فنکارانہ انداز میں کیا ہے۔ یعنی امیرؔ، نصیرؔ، نفیسؔ، انیسؔ، شفیقؔ، وحید اور محمد تقی ان تمام ناموں سے فائدہ بھی اٹھایا ہے۔ اس کے بعد امروہہ کے حوالے سے کمال امروہی کا ذکر کیا ہے۔ ایک بند ملاحظہ ہو۔

تھا وہ نام و نشان امروہہ رونق خاندان امروہہ
اس کے غم میں سیہ پوش ہوئی سرخی داستانِ امروہہ
اس کا غم سارے شہر کا غم ہے تھا وہ جانِ جہان امروہہ
ایسا امروہوی کہ کیا کہیے جان تھی اس کی جانِ امروہہ
کیسا نقصان ہوگیا اپنا
شہر سنسان ہوگیا اپنا

مرثیہ کہتے وقت جونؔ کے ذہن میں ان کے خاندان کی پوری تاریخ اور پوری تہذیب رہتی ہے۔ خاندان کا ماضی ذہن کے کینوس پر ابھرتا ہے۔ اور خاندان کے نامور نمائندے کی موت مسلسل انہیں اندر سے تڑپاتی ہے۔ اور وہ اتنے غم زدہ اور رنجیدہ ہوتے ہیں کہ وہ اپنا غم بانٹنا بھی نہیں چاہتے بلکہ صرف غم پسند نہیں وہ

ایذا پسند بھی ہو جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ

میرے برباد گھر کی بنیاد دو! اب نہ دل کو مرے سہارا دو
اے مرے داغ ہائے دل مجھ کو اپنی سوزش سے اور ایذا دو
صبر کے لفظ کو نہ سننے دو اے مرے شہر جاں کی فریاد دو!
آج کا دن نہیں شراب کا دن آج تو مجھ کو زہر پلوا دو
یہ جنازہ ہے شوکت فن کا اہل فن! اس کو بڑھ کے کاندھا دو
تھا جو بے مثل و بے مثال گیا
اپنی تہذیب کا کمال گیا

اس کے بعد اور بھی بند ہیں اور آخری بند کی بیت جس پر مرثیہ کا اختتام ہوتا ہے وہ مندرجہ ذیل ہے۔

لمحہ لمحہ پڑھا کرے انسان
نوحۂ کلّ من علیہا فان

کمالؔ امروہی کی موت پر کہا گیا جونؔ ایلیا کا یہ مرثیہ رثائی ادب میں ایک الگ شان کا مالک ہے۔ اور یہ شخصی مراثی کی تاریخ میں بحر کے اعتبار سے چاہے غالبؔ کی موت پر کہے گئے حالیؔ کے مرثیے کی بحر میں ہے، لیکن جونؔ نے ذاتی لفظیات، ذاتی تراکیب، ذاتی لہجہ اور اپنے ذاتی اسلوب کے ذریعے ان دونوں مراثی کو ایک جداگانہ شان عطا کی ہے اور ان مراثی میں وہ درد گھٹ گھٹ کے رو رہا ہے جو ان کے ماتم کدہ قلب میں چھپا ہوا ہے۔ جونؔ کی اس غم پسندی نے ہی انھیں کربلائے ذات کا شاعر بنا دیا تھا۔ بہر حال ان کے یہ دونوں مراثی شخصی مرثیہ نگاری کا اعلیٰ نمونہ اور اس میں اضافہ ہیں۔

وحید حسن وحیدؔ کے پسران میں چھوٹے پسر سید عمران حیدر حسینی بھی شاعر

ہوئے۔ نوحہ اور سلام بھی کہے اور صحافت سے بھی تعلق رہا۔ نواب وقار الملک مشتاق حسین چونکہ امروہہ کے رہنے والے تھے اور بانیان مسلم لیگ میں تھے۔ جس کے اثرات پورے امروہہ پر تھے۔ 1938ء میں سید سخا الحسنین نقوی وکیل، سابق چیئرمین میونسپل بورڈ امروہہ کے دیوان خانے میں مولانا شوکت علی مرحوم (جو امروہہ کے نواسے تھے) کی صدارت میں جلسہ ہوا تھا اور مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا قیام عمل میں آیا تھا اس میں ہی ہفتہ وار 'مسلم فیڈریشن میگزین' کا اجراء ہوا تھا۔ چونکہ یہ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا ترجمان تھا اس لیے اس میں اسی قسم کا مواد شائع ہوتا تھا۔

اس اخبار کے ایڈیٹر خادمؔ امروہوی اور سب ایڈیٹر عمران حیدر حسینؔی تھے۔ حسینؔی نے غزل کے علاوہ نظمیں بھی کہیں جو زیادہ تر سیاسی ہوتی تھیں۔ لیکن اس دور میں نوحہ خوانی اور نوحہ گوئی کا بھی ایک ماحول تھا۔ اس لیے نوحے بھی کہے۔ حسینؔی نے تقسیم کے بعد پاکستان ہجرت کی۔ لیکن پاکستان جاکر ان کی ادبی سرگرمیاں کم ہوگئیں جو کچھ ہندوستان میں کہا وہ بھی ساتھ لے گئے۔ اس لیے رثائی کلام کا ایسا نمونہ جسے وثوق سے ان کا کہا جاسکے حاصل نہیں ہوسکا۔

فیڈریشن میگزین کے بعد 1945ء میں خادمؔ امروہوی نے 'ہلال' نکالا۔ جس کی زیادہ عمر نہیں ہوئی لیکن اس کے سب ایڈیٹر بھی عمران حیدر حسینؔی اور پروفیسر بزمؔ انصاری بھی رہے۔ اب ان اخبارات کا صرف ذکر ملتا ہے نمونہ دستیاب نہیں ہوتا۔

کمالؔ امروہی کے لائق فرزند تاجدارؔ امروہی کی رگوں میں دوڑنے والے باپ کے خون نے چھپے ہوئے فنکار کو بحیثیت شاعر کچھ تاخیر سے بیدار کیا۔ انھیں باپ سے نہ صرف قلم ورثے میں مل گیا تھا بلکہ دیگر صلاحیتیں بھی کافی آگئی تھیں۔ کمالؔ امروہی کی آواز بھی انہیں ہی ملی تھی۔ لیکن چھپا ہوا شاعر سامنے نہیں آیا تھا۔

فلم رائٹر اور ڈائرکٹر کی حیثیت سے تو وہ متعارف کافی پہلے ہو گئے تھے لیکن بحیثیت شاعر پوری طرح تقریباً 98-1997ء میں سامنے آئے۔ اس سے تقریباً 7-8 سال قبل انھوں نے صرف ایک گیت اپنی فلم کے لیے کہا تھا۔ نقوش نقوی رقم طراز ہیں کہ ''تاجدار بھی اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے کئی فلمیں بنا چکے ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

جب سے دیکھا آپ کو اس دل میں مہماں آپ ہیں — میرا دل میرا جگر میری رگ جاں آپ ہیں
چپ چپاتے میرے دل کے گھر پہ قبضہ کر لیا — میں سمجھتا تھا ابھی کم سن ہیں ناداں آپ ہیں

(تذکرہ شعرائے امروہہ، کراچی پاکستان، صفحہ 383)

راقم چونکہ تاجدار سے اس وقت سے واقف ہے کہ جب وہ شعور کی سرحدوں میں قدم رکھ رہے تھے۔ ان کی کم سنی، تعلیم حاصل کرنے کے سبب دہرہ دون میں گزر رہی تھی لیکن وہاں اسکول کے انگریزی ماحول میں بھی ان کا خاندانی خون ہمیشہ جاگتا رہا اور لہجے کی کھنک انداز کی کشش آواز کی شیرینی اور خاندانی زبان کا انھوں نے کبھی ساتھ نہیں چھوڑا۔ اس دور میں بھی ان سے مل کر یہ احساس بہ آسانی ہو سکتا تھا کہ ان کے اندر ایک ذوق پرورش پا رہا ہے۔

بہر حال وہ ذوق جب نثر سے بڑھ کر شاعری تک آیا تو گیت کے بعد چند غزلیں بھی کہیں اور 98-1997ء سے نعت منقبت حمد سلام اور نوحے کہہ کر اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چلنا شروع کیا۔ انھوں نے اپنا کلام ممبئی کے علاوہ دلی اور امروہہ میں بھی پیش کیا۔

تاجدارؔ کی ایک مشہور حمد جسے انھوں نے دہلی میں حسن آرا ٹرسٹ کے ایک بہت بڑے ادبی پروگرام میں تقریباً 8-10 سال قبل پیش کیا تھا۔ اور محترمہ محسنہ قدوائی مرکزی وزیر، محترم بلرام جھاکڑ مرکزی وزیر کئی ممالک کے ایمبیسڈر ایم پی

حضرات اور اعلیٰ سامعین کے سامنے پیش کیا تھا اور سب نے بہت پسند فرمایا تھا اس کے چند بند ملاحظہ ہوں۔

اے خدا خدا ، اے خدا خدا
یہ زمیں تری، یہ زماں ترا
یہ ہیں گل ترے، گلستاں ترا
کشتیاں تری، بادباں ترا
کہکشاں تری، آسماں ترا

سب فنا فنا ، تو بقا بقا
اے خدا خدا، اے خدا خدا

ہم جمیل ہیں، اور جمال تو
ہم جلیل ہیں اور جلال تو
ہم ہیں خواب اک، اور خیال تو
ہم زوال ہیں، اور کمال تو

چھوٹے چھوٹے ہم، تو بڑا بڑا
اے خدا خدا، اے خدا خدا

ہر جگہ تری، ہر نگر ترا
ہر حجر ترا، ہر شجر ترا
راہ رو ترا، راہبر ترا
کل جہاں ترا، ہر بشر ترا

ہم خطا خطا، تو عطا عطا
اے خدا خدا، اے خدا خدا

تو غفور بھی ہے، رحیم بھی
تو نعیم بھی ہے، کریم بھی
تو علیم بھی ہے، عظیم بھی
تو کلام بھی ہے ، کلیم بھی

ہم قضا قضا، تو سدا سدا
اے خدا خدا، اے خدا خدا

یہ مکمل حمد انھیں دنوں 'روزنامہ راشٹریہ سہارا' میں بھی شائع ہوئی تھی۔

گیت کے انداز میں تاجدار نے نعتیں بھی کہیں۔ لیکن سلام گوئی پر زیادہ توجہ کی۔ دراصل وہ بچپن سے ہی پابندی سے ایام محرم میں امروہہ رہتے تھے اور مجالس اور جلوس عزا میں شرکت کرتے تھے۔ اسی عزائی فضا نے انھیں سلام گوئی کی جانب زیادہ راغب رکھا۔

حسینیہ دربار شاہ ولایت میں شب کو ہونے والی مجلس 6 محرم کو اسی خانوادے کی جانب سے ہوتی ہے۔ جس میں کئی سال مجھے بھی اپنا جدید مرثیہ پیش کرنے کا موقع ملا ہے اور ایک سال بندہ زادہ مہران امروہی سلمہ نے بھی مرثیہ پڑھا ہے۔ غالباً 2000ء میں تاجدار نے اس مجلس میں مجھے مرثیہ پڑھنے کو کہا تو میں نے اس شرط کے ساتھ وعدہ کرلیا کہ وہ اس مجلس میں اپنا کوئی سلام پڑھیں گے۔ بہر حال انھوں نے سلام پڑھا اور سامعین بہت محظوظ ہوئے۔ وہ سلام مندرجہ ذیل ہے اور یہی سلام بعد میں لکھنؤ کے مشہور اخبار ''نظارہ'' نے بہت نمایاں انداز میں شائع کیا۔

سلام

شبیرؑ زندہ باد، اے شبیرؑ زندہ باد
تو نے بڑھائی دین کی توقیر زندہ باد

سجدہ وہ تیرا بن گیا سجدوں کی آبرو
سجدہ کیا ہے جو تہہِ شمشیر زندہ باد

تونے بچالیا ہے نماز و اذان کو
قائم ہے تیرے دم سے ہی تکبیر زندہ باد

تو نے بچایا کعبے کا بجھتا ہوا چراغ
تجھ سے چراغ کعبہ کی تنویر زندہ باد

تونے نبیؐ کا خواب حقیقت بنا دیا
خوابِ خلیل پاک کی تعبیر زندہ باد

کرب وبلا کو صبر کا کعبہ بنا دیا
کی تونے اپنے خون سے تعمیر زندہ باد

کوفے کے ذرے ذرے سے آتی ہے یہ صدا
دختر علیؑ کی زینبؑ دلگیر زندہ باد

کربل کے اے مجاہد اعظم ترے نثار
شہ رگ سے تو نے توڑ دیا تیر زندہ باد

تقریر سے ہلا دیا دربار شام کو
اے شیر دل حسینؑ کی ہمشیر زندہ باد

جھنکار جس کی بن گئی آزادی کا سبق
عابدؑ تمہارے پاؤں کی زنجیر زندہ باد

وہ جس نے مسکرا کے ہرایا ہے تیر کو
اے بے زباں حسینؑ کے بے شیر زندہ باد

ایک اور سلام کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

زمین مقتل لرز رہی ہے حسینؑ میداں کو جا رہے ہیں
وہاں ہے کڑیل جواں کا لاشہ قدم یونہی ڈگمگا رہے ہیں

حسینؑ انسانیت کا، دشمن کو یہ سبق بھی سکھا رہے ہیں
وہ راستے میں ملا ہے پیاسہ یہ اس کو پانی پلا رہے ہیں

تری شہادت نے دو جہاں کو حسینؑ وہ روشنی عطا کی
کہ بام و در سب خدا کے گھر کے ابھی تلک جگمگا رہے ہیں

تاجدارؔ کے تقریباً 7 سلام اور 5 نوحے راقم کی نظر سے گزرے ہیں۔

بہر حال یہ بات باعث فخر و مسرت ہے کہ وہ سلسلہ شاعری جو عطا سے شروع ہو کر سلطانؔ، شایاںؔ، امیرؔ، نصیرؔ، ہلالؔ اور کمالؔ سے ہوتا ہوا تاجدارؔ تک آیا ہے ابھی تک باقی ہے اور وہ اپنے خانوادے کی علمی و ادبی آٹھویں پشت ہیں۔ میر انیسؔ نے فرمایا تھا کہ

ع۔ پانچویں پشت ہے شبیرؑ کی مدّاحی میں

خاندانِ فرزدق ہند شمیمؔ امروہوی میں آج قسیمؔ امروہوی پاکستان میں چھٹی پشت ہیں، کیونکہ ان کے والد شاعر آل محمدؐ نسیم امروہوی نے ایک مرثیے کے ساقی نامہ میں ساقی سے مخاطب ہو کر اس بات کا اظہار اس طرح کیا ہے کہ:

پانچ پشتوں سے ہوں پھیری میں لگانے والا
بے مئے ناب پئے اب نہیں جانے والا

بہر حال ادبی خانوادوں میں یہ بات سرمایہ افتخار مانی گئی ہے کہ کتنی نسلوں سے قلم کا سفر جاری ہے۔ اس اعتبار سے بھی خاندانِ کمالؔ امروہی امتیازی حیثیت رکھتا ہے اور خدمات بھی گراں قدر اور ناقابل فراموش ہیں۔ اس خانوادے کی صرف رثائی ادب میں خدمات کا یہ ایک سرسری جائزہ ہے۔

اب ہلالؔ کے غیر مطبوعہ سلام اور مراثی پیش ہیں:

کتابیات

انوار قم — سید صغیر حسن — کراچی، پاکستان

اردو مرثیہ پاکستان میں — سید ضمیر اختر نقوی — کراچی، پاکستان

انا منزل حسینؑ	رئیس امروہوی	کراچی، پاکستان
اوصاف علیؑ	——	آگرہ، انڈیا
بیمار مسیحا	عنبر امروہوی	امروہہ، انڈیا
تذکرۂ علمائے امروہہ	مولانا سید شہوار حسین	دہلی، انڈیا
تذکرہ شعرائے امروہہ	نقوش نقوی	کراچی، پاکستان
تنظیم محلہ دربار شاہ ولایت	سید محمد مجتبیٰ	امروہہ، انڈیا
تاریخ امروہہ	محمود احمد عباسی	ممبئی، انڈیا
تذکرۃ الاکرام	محمود احمد عباسی	انڈیا
تواریخ واسطیہ	سید رحیم بخش	امروہہ، انڈیا
تذکرہ مرثیہ نگارانِ اردو جلد۲	امیر علی جونپوری	لکھنؤ، انڈیا
تاریخ اصغری	سید اصغر حسین	امروہہ، انڈیا
حسینؑ اور حسینیت	رئیس امروہوی	کراچی، پاکستان
دبستانوں کا دبستان جلد اول	احمد حسین صدیقی	کراچی، پاکستان
دیوان مصحفی	شیخ غلام ہمدانی مصحفی امروہوی	لکھنؤ، انڈیا
دبستانِ دبیر	ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی	انڈیا
رسولیات	ڈاکٹر عظیم امروہوی	دہلی، انڈیا
روزنامچہ	علامہ شفیق حسن ایلیا	قلمی
سلور جبلی نمبر انجمن وظیفہ سادات ومومنین	اعجاز حسین جارچوی	انڈیا
مرثیہ عظیم	ڈاکٹر ہلال نقوی	کراچی، پاکستان

شعرائے امروہہ	مصباح احمد صدیقی	نئی دہلی، انڈیا
مرثیہ نگاران امروہہ	عظیم امروہوی	کراچی، پاکستان
معراجِ نفس رسولؐ	علامہ شفیق حسن ایلیا	کراچی، پاکستان
نگاہ فُقر	پروفیسر خلیق احمد نظامی	انڈیا
نظم شبیر حصہ دوم	شبیر خاں شبیر	امروہہ، انڈیا

اخبارات، رسائل وجرائد

العلم، سہ ماہی	علی جواد زیدی	ممبئی، انڈیا
پیام یار، ماہنامہ	امیر حسن امیر	دہلی انڈیا
تاج، ماہنامہ	امیر حیدر کمال	لاہور، پاکستان
جنگ، روزنامہ	جوش ملیح آبادی	کراچی، پاکستان
حیات، ماہنامہ	حیات امروہوی	امروہہ، انڈیا
حدیث دل، پندرہ روزہ	محمود نقوی	دہلی، انڈیا
رابطہ، ماہنامہ	اقبال حیدر	نئی دہلی، انڈیا
ساقی، ماہنامہ	——	دہلی، انڈیا
فیڈریشن میگزین، ہفتہ وار	خادم امروہوی	امروہہ، انڈیا
نگار، ماہنامہ	نیاز فتح پوری	کراچی، پاکستان
نظارہ، ہفتہ وار	فضل نقوی	لکھنؤ، انڈیا

مرثیہ

جب سید مظلوم اکیلے رہے رن میں

بند ۳۷

مرثیہ ہذا مصنفہ سید نفیس حسن المتخلص بہ [illegible]

مرثیہ

جب سید مظلوم اکیلے رہے رن میں
وہ زخم لگے جسم شہنشاہ زمن میں
طاقت نہ رہی فرط جراحت سے بدن میں
لکنت تھی زباں خشک تھی کانٹے تھے دہن میں
تھا درد کہ بھائی دلاور کے الم میں
اور ضعف بصر تھا علی اکبر کے الم میں

جب حد سے سوا تشنہ ہوئی پیاس کی شدت
تب ایک بلندی پہ گئے آپ بصد وقت
دکھلا کے زباں خشک یہ فرمایا بہ منت
اے ظالمو یہ رحم کے قابل مری حالت
راضی ہوں کہ خنجر مری گردن پہ پھرا دو
پر بہر خدا تھوڑا سا پانی تو پلا دو

بے کس کے ہوا غش اسد اللہ کا پیارا
روتی تھی یہ دیکھ کے فوج ستم آرا
لشکر میں ہوا شور جو رونے کا تھا نقارا
اک مومنہ نے دور سے کیا سب نظارا
بیتاب ہوئی خیمے سے باہر نکل آئی
ہاتھوں پہ لئے پانی کا ساغر نکل آئی

انیس حسن ہلالؔ امروہوی کے

سلام

و

مراثی

سلام

عالم غربت ہے اورشبیرؑ ہیں
ہر طرف سے ظالموں کے تیر ہیں

بھائی کا سر ہے سناں کی نوک پر
سر کھلے بازار میں ہمشیر ہیں

جو مسیحا ہیں جہاں کے واسطے
ہائے وہ پہنے ہوئے زنجیر ہیں

بھانجے، بیٹے، بھتیجے، مر چکے
نرغۂ اعدا میں اب شبیرؑ ہیں

اب فقط تیروں پہ ہے لاش حسینؑ
جسم میں پیوست اتنے تیر ہیں

ظالمو! اِن کے نہ سر سے لو ردا
بنت زہراؑ صاحبِ تطہیر ہیں

کربلا میں جو ہوئیں قربانیاں
خوابِ ابراہیمؑ کی تعبیر ہیں

سلام

شکرِ خالق اس نے ہم کو ایسا پیغمبرؐ دیا
جس نے اپنے بعد حیدرؑ سا ہمیں رہبر دیا

اے خدا تو نے مجھے بہتر سے بھی بہتر دیا
ساغرِ دل کو مرے عشقِ علیؑ سے بھر دیا

ان کو مجرا دین کی خاطر جنھوں نے سر دیا
ایک دن میں راہِ حق میں اپنا سارا گھر دیا

نیزۂ اہلِ ستم کو تو دلِ اکبر دیا
تیر سہہ شعبہ جو تھا اُس کے لیے اصغر دیا

کربلا آ کر سخی ابنِ سخی کے لال نے
دیں بچانے کے لیے قربان سب کچھ کر دیا

تھا جو ہمشکل نبیؐ دینِ نبیؐ کے واسطے
ام لیلیٰ نے وہ اپنا چاند سا دلبر دیا

روز محشر دیکھ لینا سب یہ سن لیں گے ہلالؔ
ساقیِ کوثر نے مجھ کو ساغرِ کوثر دیا

سلام

مجرئی شبیرؑ ہیں تنہائی ہے
کس مصیبت کی گھڑی یہ آئی ہے

گلستانِ مصطفیٰؐ پر اے فلک
کیوں گھٹا رنج والم کی چھائی ہے

کیوں اسے بے پردگی کی فکر ہو
جس کا اک عباسؑ جیسا بھائی ہے

کوئی یہ پوچھے دلِ شبیرؑ سے
لاش اصغر کس طرح دفنائی ہے

اے فلک پھٹ کر زمیں پر اب تو گر
بلوے میں اب فاطمہؑ کی جائی ہے

بھانجے عون و محمد بھی نہیں
یہ مصیبت بھی فلک نے ڈھائی ہے

اب نہ اکبر سا جواں بیٹا بچا
اب بھتیجہ ہے نہ باقی بھائی ہے

چاند پر ماہِ محرم کے ہلال
کربلا کے غم کی اک پرچھائی ہے

سلام

زمانے بھر میں ایسا حیدرِ صفدر کا اک در ہے
جہاں مفلس بھی آجائے اگر وہ بھی ابوذر ہے

جسے رشک وحسد سے دیکھنے والا سکندر ہے
زمانے بھر میں ایسا صرف اک حر کا مقدر ہے

حسینؑ ابن علیؑ تنہا ہیں اور فوجِ ستمگر ہے
نہ عباسؑ دلاور ہیں، نہ قاسم ہے، نہ اکبر ہے

ہوئی جو کربلا کی دھوپ میں سایہ فگن دیں پر
جناب ثانئ زہراؑ تمہارے سر کی چادر ہے

غضب ہے ایڑیاں جلتی زمیں پر وہ رگڑتا ہے
کہ جو ہے چاند لیلیٰ کا اور ہمشکل پیمبرؐ ہے

زمیں پر ٹوٹ کر اے آسماں تو گر پڑا ہوتا
محمدؐ کی نواسی اور بلوے میں کھلے سر ہے

اسے بھی روضہ انور پہ اب بلوائیے اپنے
ہلالؔ غم زدہ بھی آپ کا مولا سخنور ہے

سلام

مجرئی مقتل میں تنہا حضرت شبیرؑ ہیں
در پہ خیمے کے پریشاں زینبؑ دلگیر ہیں

یہ نبیؐ کی جان ہیں اور بولتا قرآن ہیں
سجدہ خالق میں جو اس دم تہہِ شمشیر ہیں

زانوئے شبیرؑ بھی رومال زہراؑ بھی ملا
کربلا میں حُر فقط وہ صاحبِ تقدیر ہیں

جن کا سینہ تم نے اک برچھی سے چھلنی کردیا
اے لعینو! یہ رسولؐ اللہ کی تصویر ہیں

لاش اکبر کو تو میداں سے شہِ دیں لا چکے
اپنے ہاتھوں پر لئے اب لاشہ بے شیر ہیں

دین حق ظالم کے پنجے سے چھڑانے کے لیے
سیدِ سجادؑ بھی پہنے ہوئے زنجیر ہیں

یہ سلام و مرثیے جتنے بھی ہیں میرے ہلالؔ
زندگی بھر کی مری سب سے بڑی جاگیر ہیں



مرثیہ

1

جس دم ادا نمازِ سحر کی امام نے
تاج نبیؐ سے زینتِ سر کی امام نے
زیب کمر حسام پدر کی امام نے
مرنے پہ چست اپنی کمر کی امام نے
رخصت طلب کی خواہر ناشاد کام سے
گھبرا کے وہ لپٹ گئی پائے امام سے

۲

کہتی تھی صدقے آپ کے خواہر، نہ جایئے
مرجاؤں گی تڑپ کے برادر، نہ جایئے
بیکس بہن کو چھوڑ کے باہر، نہ جایئے
بہر خدا برائے پیمبرؐ، نہ جایئے
بھیا خبر جو کوچ کی اپنے سناتے ہو
زینب کو کس کے آسرے پر چھوڑے جاتے ہو

۳

شہہ کہتے تھے کہ صبر کرو صبر، اے بہن
ہوگا وہی جو چاہے گا معبودِ ذوالمنن
ہم قتل ہوں گے اور حرم قیدیِ رسن
کہتی تھی وہ، غضب ہے یہ رنج اور یہ محن
افسوس آپ منع کریں میں بکا کروں
قابو میں دل نہیں مرا، بھائی میں کیا کروں

۴

بھولی ہوئی تھی سب الم وصدمہ و محن
جب دیکھتی تھی آپ کی صورت یہ خستہ تن
کہتی تھی میں جہاں میں سلامت ہیں پنجتن
کیوں بھائی کس کی آس پہ بیٹھے گی اب بہن
میں عرض صاف کرتی ہوں ہاتھوں کو جوڑ کر
جاتے ہیں آپ کس پہ بھرے گھر کو چھوڑ کر

۵

مُجھ سے یہ صبر ہو گا نہ بھیّا، بہن نثار
دل ذکرِ سن کے ہوتا ہے سینے میں بیقرار
رخصت دوں آپ کو یہ نہیں ہو گا زینہار
باہر قدم رکھا تو جیئے گی نہ سوگوار
یہ غم نہ اے امامِ زمن دے کے جایئے
مرلوں تو مجھ کو غسل وکفن دے کے جایئے

٦

پھر بولی دیکھ کر سوئے یثرب وہ نوحہ گر
اے اماں تم حسینؑ کی لیتی نہیں خبر
لٹتا ہے آج دشت بلا میں ہمارا گھر
ہے ہے تمہارے لال کا دنیا سے ہے سفر
تربت سے آکے حق کے فدائی کو روک لو
قربان ہوں گی تم مرے بھائی کو روک لو

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

۵

مُجھ سے یہ صبر ہوگا نہ بھیّا، بہن نثار
دل ذکرِ سن کے ہوتا ہے سینے میں بیقرار
رخصت دوں آپ کو یہ نہیں ہوگا زینہار
باہر قدم رکھا تو جئے گی نہ سوگوار
یہ غم نہ اے امامِ زمن دے کے جایئے
مرلوں تو مجھ کو غسل وکفن دے کے جایئے

٦

پھر بولی دیکھ کر سوئے یثرب وہ نوحہ گر
اے اماں تم حسینؑ کی لیتی نہیں خبر
لٹتا ہے آج دشت بلا میں ہمارا گھر
ہے ہے تمہارے لال کا دنیا سے ہے سفر
تربت سے آکے حق کے فدائی کو روک لو
قربان ہوں گی تم مرے بھائی کو روک لو

۷

مرتا ہے ابن شیر الٰہی، میں کیا کروں
دنیا سے بھائی ہوتا ہے راہی میں کیا کروں
لٹتی ہے آج مسند شاہی میں کیا کروں
بستی پرائی اور یہ تباہی میں کیا کروں
کس کس کو ہائے میں دم غارت چھپاؤں گی
رانڈوں کا قافلہ یہ کدھر لے کے جاؤں گی

۸

بیٹھوں کہاں، جو فوجِ ستم لوٹنے کو آئے
اتنا تو ہوئے کوئی جو کہنہ ردا بچائے
الٹے مرے نصیب بڑھاپے میں ہائے ہائے
اماں کو آج ڈھونڈ کے زینبؑ کہاں سے لائے
اماں جو کہہ گئی ہیں اسے یاد کیجئے
کچھ تو بہن کے باب میں ارشاد کیجئے

۹

شہ بولے اے اسیرِ محن، صبر چاہیے
جب ذبح ہو یہ تشنۂ دہن، صبر چاہیے
بھائی کو رونے والی بہن، چاہیے
جس دم بندھے گلے میں رسن، چاہیے
لاشے ابھی تو لے کے کئی بار آئیں گے
رو لیجیو وقتِ عصر جو مرنے کو جائیں گے

۱۰

پیٹو نہ سر کو، بہر رسولؐ زمن بہن
عاشق بہن، غریب بہن، کم سخن، بہن
غربت زدہ بہن، میری تشنہ دہن بہن
صدقے میں تیرے، حاملِ رنج و محن بہن
تھاموگی دل کو تم تو ٹھہر جائے گا حسینؑ
روؤ گی سر پٹک کے تو مر جائے گا حسینؑ

۱۱

زینبؑ تمہارے بعد خدا ہے نگاہباں
وہ کیجیو جو کہ کر گئیں زہراؑ تمہاری ماں
کہہ دیجیو غش سے چونکے جو سجادِ ناتواں
یہ گھر ترے سپرد ہے اب اے پدر کی جاں
تم ہو امامِ وقت یتیموں کو پالنا
اب ہم تو مرنے جاتے ہیں تم گھر سنبھالنا

۱۲

کہتے تھے یہ بہن سے ابھی شاہِ نیک نام
جو رن میں آئی بہرِ وغا فوج روم و شام
تیار اس طرف تھے جوانانِ تشنہ کام
لے لے کے اذنِ جنگ گئے اور ہوئے تمام
خنجر سے ذبح لختِ دل فاطمہؑ ہوا
جس جا تھی قتل گاہ وہیں خاتمہؑ ہوا

۱۳

اس وقت پہنچی زینبؑ ناشاد و نوحہ گر
جب شمر ہاتھ میں لئے جاتا تھا شہ کا سر
بکھری ہوئی تھیں چہرہ پہ زلفیں ادھر اُدھر
رخسار دونوں زرد تھے اور لب تھے خوں میں تر
تھی خاک سے اٹی ہوئی صورت حسینؑ کی
آنکھیں کھلی تھیں فاطمہؑ کے نور عین کی

۱۴

قرآن پڑھ رہا تھا سرِ ابن بوترابؑ
اور ریش میں کھلا ہوا تھا جابجا خضاب
روشن تھا بعدِ قتل بھی رُخ مثلِ آفتاب
ظاہر تھا یہ لبوں سے کہ پایا نہیں ہے آب
آنکھوں سے یہ عیاں تھا کہ دنیا سے جاتے ہیں
ثابت یہ خشک ہونٹوں سے تھا مسکراتے ہیں

۱۵

چلائی سر کو پیٹ کے زینبؑ جگر فگار
ہے ہے شہید ہو گیا اماں کا یادگار
سید تری کھلی ہوئی آنکھوں کے میں نثار
بھیا بہن کے آنے کا تم کو تھا انتظار
شاید ابھی چلی ہے چھری حلقِ پاک پر
تازہ لہو رگوں سے ٹپکتا ہے خاک پر

۱۶

کیا چپکے چپکے جان دی یا شاہِ دیں پناہ
سر تن سے کٹ گیا نہ پکارا بہن کو آہ
آئی صدا کہ بات کی مہلت ملی نہ آہ
زینبؑ ہمارے حال کی ہیں فاطمہؑ گواہ
خنجر گلے پہ سینہ پہ قاتل سوار تھا
اس جبر میں بہن مرا کیا اختیار تھا

۱۷

قاتل بڑھا جو لیکے سرِ سرورِ زمن
کس یاس سے کہا کہ خدا حافظ اے بہن
پھیلا کے دونوں ہاتھوں کو دوڑی وہ بے وطن
آئی صدائے دخترِ محبوبِ ذوالمنن
بیٹی ترے شہید برادر کے ساتھ ہوں
تو جا کے ڈھونڈ لاش کو میں سر کے ساتھ ہوں

۱۸

چلّائی وہ کہ لاشۂ عریاں ہے کس طرف
ہے ہے تنِ امامِ غَریباں ہے کس طرف
اے طائرو وہ فخرِ سلیمانؑ ہے کس طرف
اے دشت کربلا ترا مہماں ہے کس طرف
زہرا کی عمر بھر کی کمائی کو کیا کیا
بتلا دے اے زمیں مرے بھائی کو کیا کیا

۱۹

ہے کس مقام پر مرے بھائی کی قتل گاہ
اے خاک کس نشیب میں ہے فاطمہؑ کا ماہ
اے ارضِ نینوا مجھے ملتی نہیں ہے راہ
اے آسماں یہ کیا ہے کہ دن ہوگیا سیاہ
اے شامِ غم وہ گیسوؤں والا کدھر گیا
اے آفتاب تیرا اجالا کدھر گیا

۲۰

یہ کہتی تھی کہ لاشۂ بے سر نظر پڑا
بس دوڑ کر لپٹ گئی وہ غم کی مبتلا
چلائی ہائے بھائی یہ کیسا ستم ہوا
آئی صدا یہ لاش سے، جو مرضی خدا
کچھ غم نہیں جو ذبح میں ناکام ہوگیا
امّت کی مغفرت کا سرانجام ہوگیا



1

دیکھ کر چاند محرم کا نمایاں زینب
شاہ گھبرا گئے ایسے ہوئی گریاں زینب
یہ دعا کرنے لگی باسر عریاں زینب
یا الٰہی نہ ہو غربت میں پریشاں زینب
رہے قائم مری اماں کی کمائی مولا
خیر سے جائے وطن کو مرا بھائی مولا

۲

میرے بھائی کو کبھی ہو نہ کوئی رنج و محن
بچے جیتے رہیں سرسبز رہے یہ گلشن
لے کے سب کنبہ کو ہمراہ چلیں سوئے وطن
شاد و آباد ہمیشہ رہیں سلطان زمن
شور ہو خلق میں شبیرؑ کی یکتائی کا
نام قائم رہے دنیا میں مرے بھائی کا

۳

دھوم سے ہو مرے ہمشکل نبی کی شادی
گھر کی بانو کے بہو پوتے سے ہو آبادی
رہے دنیا میں سہاگن عجمی شہزادی
کبھی گلزار میں زہرا کے نہ ہو بربادی
رونگٹا دہر میں میلا نہ کسی کا ہوئے
میرے بھائی کا کبھی بال نہ بیکا ہوئے

۴

میری صغرا جو ہے بیمار شفا دے اس کو
اس کے ماں باپ سے تو جلد ملا دے اس کو
صورتِ اکبرِ گلفام دکھا دے اس کو
خبرِ واپسیِ شاہ سنا دے اس کو
غل ہو یثرب میں شہ بدر وحنین آتے ہیں
لو مبارک ہو مبارک ہو حسینؑ آتے ہیں

۵

اس طرف تو یہ دعا کرتی تھی بنت حیدر
اس طرف دیکھتے تھے چاند شہ جن وبشر
التجا کرتے تھے اللہ سے یہ رو رو کر
راہ میں تیری شہادت ہو مری اے داور
ماہ زہرا کو یہ چاند ایسا مبارک ہووے
ٹکڑے ٹکڑے ہو بدن تیغ بہ تارک ہووے

۶

سر کٹا کر ترے دربار میں حاضر ہو غلام
گود میں لاشہِ معصوم بدن زخمی تمام
میں تو حاضر ترے دربار میں ہوں بہر سلام
اور مرے اہلِ حرم قید ہوں جل جائیں خیام
بدلے پانے کے مجھے خنجر بے آب ملے
خلق میں شاہِ شہیداں مجھے القاب ملے



۷

حشر تک دھوم رہے خلق میں مظلومی کی
سب قسم کھائیں مری رنجش و مغمومی کی
یعنی شبیرؑ سے وہ شامیوں نے شومی کی
آل تک کٹ گئی اس خاصۂ قیومی کی
سارے گھر بار کو برباد کیا اعدا نے
اس کے بچوں کو بھی پانی نہ دیا اعدا نے

۸

راہ میں تیری مجھے سہل ہیں سب رنج و محن
سرفرازی ہے جو خنجر سے کٹے گی گردن
حشر تک سب کی زبانوں پہ رہے گا یہ سخن
صاف شبیرؑ میں تھا اپنے بزرگوں کا چلن
صابر ایسا ہو جو پیاسا ہو تو ایسا ہووے
ایسے نانا کا نواسا ہو تو ایسا ہووے



۹

جب مرے سینۂ زخمی پہ چڑھے شمر شریر
اس گھڑی میری مدد کیجیو اے رب قدیر
ہے ترے لطف و عنایات کا طالب شبیرؑ
صبر اور شکر سے گزرے وہ مرا وقت اخیر
جلد گردن پہ رواں خنجرِ برّان ہووے
مشکلِ ذبح بھی شبیرؑ پہ آساں ہووے

۱۰

حلق پر تیغ ہو اور سینہ پہ ہووے جلاد
ہے یہ امید کہ اس دم بھی یونہیں ہو تری یاد
نہ غم اہل حرم ہو نہ خیال اولاد
کان تک میری سکینہ کے نہ پہنچے فریاد
دھیان بیٹے کا نہ بیٹی کا نہ ہمشیر کا ہو
ذکر تحلیل کا تسبیح کا تکبیر کا ہو

۱۱

نکلیں سید انیاں خیمے سے جو کھولے ہوئے سر
سر اٹھا کر تہہ سجدہ سے نہ دیکھوں میں ادھر
کوئی لڑکی جو کہے ہائے پدر ہائے پدر
محو ایسا ہوں کہ مطلق نہ مجھے ہووے خبر
قید اعدا میں یداللہ کی جائی ہووے
میرے مولا مگر امت کی رہائی ہووے

۱۲

سن کے یہ رونے لگے شہ کے رفیق و یاور
اور تڑپنے لگی محمل میں علیؑ کی دختر
رو کے بولی تری مظلومی کے صدقے خواہر
سر و سینہ پہ لگیں دشمنوں کے تیر و تبر
رتبے سب تم کو دئے حق نے یہ کیا مانگتی ہو
کیا برس دن کے برس دن یہ دعا مانگتی ہو

۱۳

صدقے خواہر ہو یہ کیا کرتے ہو رویت کی دعا
ہاں مناسب ہے کرو بخشش امت کی دعا
نہ دعا چین کی ہے اور نہ راحت کی دعا
آپ فرماتے ہیں اس وقت شہادت کی دعا
کسی غم میں نہ بہن مضطرب الحال رہے
خلق میں آپ کا سایہ صد و سی سال رہے

۱۴

شہ نے فرمایا نہ مضطر ہو بہت اے شمشیر
ہجر میں بھائی کے دے صبر تمہیں رب قدیر
کبھی مٹتا نہیں تقدیر میں جو ہو تحریر
زور انساں کا ہے کیا موت ہو جب دامنگیر
اے بہن خلق میں اب زیست سے بیزار ہوں میں
سر کہیں جلد اتر لے تو سبکبار ہوں میں

۱۵

اپنے سر کٹنے کا کچھ مجھ کو نہیں رنج و ملال
حرمتِ عترت اطہار کا صدمہ ہے کمال
مجھ پہ ظاہر ہے کریں گے جو ستم بدافعال
قلب تھراتا ہے آتا ہے جو تم سب کا خیال
پر یہ تسکیں ہے کہ عالم کا مددگار تو ہے
خیر گر کوئی نہیں ایزد غفار تو ہے

۱۶

پیٹ کر سینہ و سر بنت علیؑ چلائی
دل غمگین پہ مرے چل گئی برچھی بھائی
بے چھری مر گئی اس وقت بہن دکھ پائی
یہ ستم دیکھنے کو یاں مجھے قسمت لائی
میں زمانے میں فراق شہ ذی جاہ سہوں
دم نہ نکلے مرا اور یہ غم جانکاہ سہوں

۱۷

تم سے بھائی پہ لعینوں کی جفا دیکھوں میں
خونِ لختِ جگرِ شیرِ خدا دیکھوں میں
شمر کی تیغ کے نیچے یہ گلا دیکھوں میں
لاشِ فرزندِ رسولؐ دوسرا دیکھوں میں
دل تڑپتا ہے کلیجہ مرا تھراتا ہے
کیا یہ فرماتے ہو بھیّا مجھے غش آتا ہے

۱۸

اس طرح مضطر و نالاں جو ہوئی زینب زار
بولے سر چھاتی سے لپٹا کے امام ابرار
مضطرب ہو نہ بہن تم پہ یہ بھائی ہو نثار
صبر کا اجر ہے خوشنودیٔ ربِّ غفار
کوئی جینے کا نہیں خلق میں جو آیا ہے
جس کے ہم عبد ہیں اس نے ہمیں بلوایا ہے

۱۹

جب کہ ہمشیر سے فرماتے تھے یہ شاہِ امم
حشر تھا محملوں میں روتے تھے سب اہلِ حرم
یہی ہر ایک کی خالق سے دعا تھی اس دم
یا الٰہی رہے سردار ہمارا قائم
پڑ گئے جان کے اس کی ہمیں لالے یا رب
ابنِ زہراؑ ہے بس اب تیرے حوالے یارب

۲۰

وطن آوارہ ہے سید ہے مسافر ہے یہ
مرقدِ احمدؐ و زہراؑ کا مجاور ہے یہ
ہر جفا و ستم و ظلم پہ شاکر ہے یہ
بیکس و مضطر و بے یاور و ناصر ہے یہ
یہی کہہ کہہ کے ادھر اہلِ حرم روتے تھے
اُس طرف شاہ بھی گردن کیئے خم روتے تھے

۲۱

اے ہلالؔ اب ہوا مجلس میں بپا اک کہرام
جوش گریہ سے تجھے بھی نہیں یارائے کلام
روک لے تو بھی بس اب توسن خامہ کی لگام
کر دعا حق سے کہ بر آئیں مرے جتنے ہیں کام
سخن حق یہ اسی احقر ناشاد کا ہے
مرثیہ میرا ہے مطلع کسی استاد کا ہے



۱

جب پیاس کی شدت ہوئی بیحد شہِ دیں پر
سنبھلا نہ گیا ضعف سے پھر خانۂ زیں پر
بے ساختہ گھوڑے سے گرے آپ زمیں پر
فریاد کا اک شور ہوا عرش بریں پر
کہتے تھے ملائک یہی افلاک کے اوپر
کیا قہر ہے خورشید گرا خاک کے اوپر

۲

پھر اٹھے زمیں سے شہ ذی جاہ بدقت
اور ایک بلندی پہ گئے با غم و حسرت
دکھلا کے زباں خشک یہ فرمایا بہ منت
اے ظالمو ہے رحم کے قابل مری حالت
راضی ہوں کہ خنجر مری گردن پہ پھرا دو
پر بہر خدا تھوڑا سا پانی تو پلا دو

۳

دیکھو میں تمہارے ہی نبی کا ہوں نواسا
اور آج ہوں میں تین شب و روز سے پیاسا
کیا تم میں نہیں کوئی پیمبرؐ کا شناسا
جو آن کے دے مجھ کو تسلی و دلاسا
ہے کوئی جو پانی مجھے اک جام پلا دے
تا حشر کے دن اس کی جزا اس کو خدا دے

۴

اے ظالمو شبیرؑ ہے مہمان تمہارا
اب رحم کرو رحم کرو مجھ پہ خدا را
تم نے مرے انصار کو کس ظلم سے مارا
اب کوئی زمانے میں نہیں میرا سہارا
کیوں درپئے آزار مرے ہوتے ہو یارو
دنیا کی عوض دین کو کیوں کھوتی ہو یارو

۵

ہر چند ستمگاروں کو سمجھاتے تھے مولا
جز تیر جواب اور نہ کچھ پاتے تھے مولا
بے چین تھے بیتاب تھے گھبراتے تھے مولا
پھر رو کے لعینوں سے یہ فرماتے تھے مولا
حالت پہ مری چھوڑ دو مجھ تشنہ دہن کو
گر رائے تمہاری ہوتو پھر جاؤں وطن کو

٦

تم نے مجھے خط بھیج کے تھا گھر سے بلایا
میں اپنا وطن چھوڑ کے یاں خود نہیں آیا
یاں آکے بہت رنج والم میں نے اٹھایا
تم نے مجھے بے جرم وخطا آہ ستایا
افسوس ہے تم سب میں شقاوت نظر آئی
دعوت کی عوض اور عداوت نظر آئی



۷

حضرت کی نہیں بھولتی وہ تشنہ دہانی
رو رو کے طلب کرتے تھے ایک ایک سے پانی
پر کیسے ستمگار تھے وہ ظلم کے بانی
اک بات پیمبر کے نواسے کی نہ مانی
کہتے تھے کہ اک قطرہ بھی پانی کا نہ دیں گے
ہم آپ کو پیاسا ہی ابھی قتل کریں گے

۸

یہ سنتے ہی بے آس ہوئے سید ذی جاہ
فرمایا کہ افسوس ہے اے فرقہ گمراہ
کہنے کا مرے کچھ نہ اثر تم پہ ہوا آہ
اب حشر میں تم اس کی سزا پاؤ گے واللہ
اللہ سے اس دن میں طلب داد کروں گا
اس پیاس کی اس بھوک کی فریاد کروں گا



۹

یہ کہہ کے چلے جانب خیمہ شہ والا
تھا پیاس کی شدت سے کلیجہ تہ وبالا
سنبھلا نہ گیا آپ کو ہر چند سنبھالا
بے ساختہ نکلا دہن خشک سے نالا
پہنچی جو صدا بھائی کی گھبرا گئیں زینب
فوراً در خیمہ کے قریب آگئیں زینب

۱۰

القصہ ہوئے داخل خیمہ شہ عالم
بھائی سے گلے ملنے لگیں زینب پر غم
فرمانے لگے سید ذی جاہ یہ اس دم
رخصت دو کہ رخصت کیلئے آئے ہیں اب ہم
حالت ہے جو اب دل کی دکھائی نہیں جاتی
اب پیاس کی تکلیف اٹھائی نہیں جاتی

۱۱

تھی آٹھویں تاریخ محرم کی ہے لکھّا
اک قافلہ اس دشت میں جو آن کے ٹھہرا
عاشور کے دن بعد زوال آن کے اس جا
اس قافلہ والوں کو کسی نے یہ سنایا
اک فوج نے کچھ لوگوں کو یاں قتل کیا ہے
اور لاشوں کو بے دفن وکفن چھوڑ دیا ہے

۱۲

پر ایک سوار آہ جو زخمی ہے سراپا
نرغہ میں ستمگاروں کے ہے یکہ و تنہا
وہ سوکھی زباں پھیر کے ہونٹوں پہ ہے کہتا
اے ظالمو پانی دو میں شدت سے ہوں پیاسا
بی مونس ویاور ہوں گرفتار محن ہوں
مظلوم ہوں، بیکس ہوں اور آوارہ وطن ہوں

۱۳

اس فوج ستمگار میں اتنا نہیں کوئی
جو آن کے اس شخص کو دے تھوڑا سا پانی
پانی کی عوض تیر وہ برساتے ہیں ناری
میں کیا کہوں اس شخص کی وہ گریہ وزاری
مظلوم ہے اور سخت مصیبت میں گھرا ہے
اور پانی ہر اک شخص سے وہ مانگ رہا ہے

۱۴

اب آگے ہے اس طرح سے مضمون روایت
اک مومنہ جس کی تھی مدینہ میں سکونت
اس قافلہ کے ساتھ تھی وہ صاحب ہمت
بیتاب ہوئے سن کے یہ پُر درد حکایت
دیندار تھی عاشق تھی امام دوسرا کی
ہمنام تھی وہ بنتِ بتولِؑ عزرا کی

۱۵

ہیں زینب و کلثوم جو بنت اسداللہ
کھیلی تھی لڑکپن میں وہ ان دونوں کے ہمراہ
تھی شام میں مدت سے مقید وہ مگر آہ
ان روزوں رہا ہو کے وہ آئی تھی اسی راہ
کچھ یاں کی خبر تھی نہ گرفتار محن کو
جاتی تھی اسی قافلہ کے ساتھ وطن کو

۱۶

افسوس تھی اس مومنہ کے دل میں یہ حسرت
اب جا کے وطن دیکھوں گی اکبر کی میں صورت
روضہ کی پیمبرؐ کے بھی ہوئے گی زیارت
دیکھوں گی میں اب مرقد خاتون قیامت
میں حضرت شبیرؑ کے قدموں پہ گروں گی
اور زینب و کلثوم کے بھی گرد پھروں گی

۱۷

معلوم نہ تھا یہ کہ مدینہ ہوا ویراں
ہمشکل پیمبرؐ بھی ہوا خاک میں پنہاں
میں چھوٹ کے جاتی ہوں وطن بادلِ شاداں
اور زینب و کلثوم کی ہے قید کا ساماں
مشتاق زیارت ہوں حسین ابن علیؑ کی
یاں جان ہے آفت میں پڑی سبط نبیؐ کی

۱۸

القصہ وہ ہاتھوں پہ لئے پانی کا ساغر
روتی ہوئی صحرا کو چلی بادل مضطر
اس وقت میں پہنچی وہ حضور شہ صفدر
جب خیمہ اقدس سے نکلتا تھا وہ سرور
درپیش شہادت تھی شہنشاہ امم کو
اور آخری رخصت کئے آتے تھے حرم کو

۱۹

دیکھا درِ خیمہ پہ قیامت کا یہ ساماں
کچھ عورتیں کچھ بچے ہیں با حالِ پریشاں
جب شاہ بڑھاتے ہیں قدم جانب میداں
تب بیبیاں ہاتھوں سے پکڑ لیتی ہیں داماں
اور شاہ کے قدموں سے لپٹ جاتے ہیں بچے
روتے ہوئے خیمہ سے نکل آتے ہیں بچے

۲۰

فرماتے ہیں شہ صبر کرو صبر خدارا
گھبراؤ نہ خالق ہے نگہبان تمہارا
اللہ کی مرضی میں کسی کا نہیں چارا
تم سب کرو اب ہجر ہمارا بھی گوارا
ہم کیا کریں، بس اس میں ہمارا نہیں کوئی
جب سر پہ قضا آئی تو چارا نہیں کوئی

۲۱

اے بی بیو یہ میری سکینہ جو ہے پیاری
میں دیتا ہوں اب اس کو حفاظت میں تمہاری
ماریں گے مرے بعد طمانچے اسے ناری
اس وقت کرے گی یہ بہت گریہ وزاری
لازم ہے کہ سینہ سے لگا لیجیو اس کو
اعدا کے طمانچوں سے بچا لیجیو اس کو

۲۲

جاتی ہی نہیں دل سے مرے چاہ تمہاری
ہے شاق جدائی مجھے واللہ تمہاری
کرتی ہے کلیجہ مرا شق آہ تمہاری
ہر حال میں لے گا خبر اللہ تمہاری
لو جاتے ہیں بس اب تمہیں اللہ کو سونپا
گھر فاطمہ زہرا کا یداللہ کو سونپا

۲۳

یہ کہ کے چلا پھر اسداللہ کا جانی
وہ مومنہ کہنے لگی حاضر ہے یہ پانی
پی لیجئے اس کو کہ بجھے تشنہ دہانی
حضرت نے یہ فرمایا بصد اشک فشانی
گھیرے ہے اجل دیر مرے مرنے میں کیا ہے
دنیا سے چلا جاؤں میں پیاسا تو بجا ہے

۲۴

خیمہ میں ہے پر ایک مری خواہر مضطر
اس پانی کو تو اس کو پلا دے وہاں جا کر
کرلیں گے اسے قید مرے بعد ستمگر
پھر ہوگا نہ پانی اسے جی بھر کے میسر
وہ بولی کہ پیاس اپنی بجھا لیجئے حضرت
پہنچوں میں گھر اپنے یہ دعا کیجئے حضرت

۲۵

اور جن کی زیارت کی میں رکھتی ہوں تمنا
ان لوگوں کو دکھلائے مجھے خالق یکتا
برسوں سے ہوں آوارہ وطن اے مرے آقا
ان آنکھوں سے دیکھوں میں گھر اپنا وطن اپنا
فرمایا شہ دیں نے کہ گھر تیرا کہاں ہے
کی عرض کہ لونڈی کا مدینہ میں مکاں ہے

۲۶

سن کر یہ سخن رونے لگے سید ذی جاہ
فرمایا کہ ہم سے بھی وطن چھوٹ گیا آہ
اس بے کسی و یاس میں گزرے ہیں کئی ماہ
گھر اپنا بہت ہم کو بھی یاد آتا ہے واللہ
کہہ جلد جدائی یہ تجھے شاق ہے کس کی
بتلا دے مدینہ میں تو مشتاق ہے کس کی

۲۷

یاں پر تو مرے حال کا پرساں نہیں کوئی
تو کون ہے جو میرے لئے لائی ہے پانی
وہ بولی میں کیا عرض کروں اے شہ عالی
اک قافلہ کے ساتھ یہاں آئی ہے لونڈی
گھر چھٹنے کے باعث سے تڑپتی مری جاں ہے
میرا بنی ہاشم کے محلّہ میں مکاں ہے

۲۸

اور زینب خاتون جو ہے دختر زہراؑ
کھیلی ہوں لڑکپن میں میں ساتھ اس کے ہمیشہ
جو نام ہے بی بی کا وہی نام ہے میرا
دنیا میں رکھے شاد اسے خالق یکتا
بے چین ہوں اس سے مجھے اللہ ملا دے
زینب کا مجھے چہرہ پرنور دکھا دے

۲۹

آقا ہے مرا احمدؐ وحیدرؑ کی نشانی
شبیرؑ ہے نام اور ہے زہراؑ کا وہ جانی
دنیا میں کوئی اب نہیں اس شاہ کا ثانی
دن رات اسی کی مجھے رہتی ہے کہانی
ہوں جلد قدمبوس میں اس حق کے ولی کی
بے چین ہوں فرقت سے حسین ابن علیؑ کی

۳۰

اس وقت مگر اس کی بڑی ہے مجھے حیرت
آقا سے مرے آپ مشابہ ہیں نہایت
ہے فرق بس اتنا کہ جواں ہیں مرے حضرت
اور آپ کی اس وقت ضعیفی کی ہے حالت
ہے پشت بھی خم آپ کی اور زرد جبیں ہے
لیکن لب ولہجہ میں تو کچھ فرق نہیں ہے

۳۱

معلوم یہ ہوتا ہے کہ اس دم مرے آقا
گھوڑے پہ ہیں اسوار مرے سامنے گویا
یہ دشت کہاں اور کجا سیدوالا
اللہ رکھے ان کو مدینہ میں ہمیشا
آرام سے یثرب میں وہ شاہ دوجہاں ہو
خالق کرے ہرگز نہ صحیح میرا گماں ہو

۳۲

یہ سنتے ہی شہ کو نہ رہا ضبط کا یارا
رونے لگے اور زینب بیکس کو پکارا
بھائی کی صدا کان میں پہنچی جو قضارا
فوراً درِ خیمہ پہ چلی آئیں دوبارا
کہنے لگیں اے بھائی کہو جلد کہ کیا ہے
کس واسطے ہمشیر کو اب یاد کیا ہے

۳۳

بولے شہ ذی جاہ کہ اے غم کی ستائی
پانی کے پلانے کو طلب کرتا ہے بھائی
کہ عرض کہ حضرت نے بھی پیاس اپنی بجھائی
فرمانے لگے رو کے شہ کرب وبلائی
تم پی لو، لب اپنے، میں کبھی تر نہ کروں گا
اے خواہر ناشاد میں پیاسا ہی مروں گا

۳۴

ہمشیر یہ پانی مجھے کیونکر ہو گوارا
جس کے لئے عباسؑ سا بھائی گیا مارا
اکبر مرا پیاسا ہی زمانے سے سدھارا
اور تشنہ دہن مرگیا اصغرا مرا پیارا
ہے خاک مرے جینے پہ بعد ان کے جیوں میں
مرجائیں یہ سب تشنہ لب اور پانی پیوں میں

۳۵

وہ مومنہ پہلے ہی سے تھے سخت پریشاں
باتیں جو سنیں یہ تو ہوئی اور بھی حیراں
دیکھا جو اسے زینب دلگیر نے اُس آں
دل میں کہا یہ کون ہے اس طرح سے گریاں
آنکھوں سے رواں متصل اشکوں کی لڑی ہے
اور ہاتھ میں کوزہ لئے پانی کا کھڑی ہے

۳۶

کہنے لگیں تو کون ہے اے خاصہ باری
رہتی ہے کہاں، اشک ہیں کیوں آنکھوں سے جاری
وہ مومنہ اس وقت یہ رو رو کے پکاری
رونے کا سب کیا کہوں میں درد کی ماری
حیران ہوں، مضطر ہوں، بڑی فکر میں جاں ہے
اے بی بی مرا شہرِ مدینہ میں مکاں ہے

۳۷

پر اپنا وطن مجھ کو بس اب جلد بتاؤ
للہ نہ لونڈی سے اب احوال چھپاؤ
دھوکہ مجھے ہوتا ہے مرا دل نہ دکھاؤ
تم کون ہو کچھ اپنی حکایت تو سناؤ
طرز آپ کا اب ہوش مرے کھوتا ہے بی بی
تم پر مجھے زینب کا گماں ہوتا ہے بی بی

۳۸

یہ سنتے ہی شہ کو نہ رہا ضبط پہ قابو
سر پیٹ لیا آنکھوں سے جاری ہوئے آنسو
اور تھام کے پھر خواہر ناشاد کا بازو
فرمانے لگے اس سے یہ شاہنشہِ خوشخو
اے مومنہ زینب یہی آوارہ وطن ہے
شبیرؑ ہوں میں اور یہی میری بہن ہے

۳۹

یاں آن کے اس طرح پھرا ہم سے زمانا
پانی نہ میسر ہے نہ امکان میں کھانا
رکھتا ہے روا ہم کو ہر اک شخص ستانا
امت نے نواسا بھی پیمبرؐ کا نہ جانا
ہم کون ہیں، افسوس، نہیں جانتے ہم کو
اب دوست بھی اپنے نہیں پہچانتے ہم کو

۴۰

یہ کہنے لگی شاہ سے وہ خاصہ باری
پھٹتا ہے جگر اب نہ کرو گریہ و زاری
ماں باپ مرے تم پہ فدا اور میں واری
آقا کہوں کیا ہوگیا حالت کو تمہاری
یاں آن کے میں کشتۂ غم ہوگئی آقا
کیا ہوگیا جو پشت بھی خم ہوگئی آقا

۴۱

رو کر کہا اس سے یہ شہنشاہ امم نے
اے مومنہ توڑی کمر عباسؑ کے غم نے
دل توڑ دیا اکبر مہرو کے الم نے
کمزور کیا آہ لعینوں کے ستم نے
جی سے علی اصغر کو گزرتے ہوئے دیکھا
اور قاسم ناشاد کو مرتے ہوئے دیکھا

۴۲

کیا پوچھتی ہے تو مرے اس ضعف کی حالت
میں کیا کہوں جو آج پڑی مجھ پہ مصیبت
انصار کے مرجانے سے جاتی رہی قوت
لاشوں کے اٹھانے سے گئی جسم کی طاقت
حالت ہے جواب دل کی دکھائی نہیں جاتی
اب ضعف کی تکلیف اٹھائی نہیں جاتی

۴۳

سن کر یہ سخن شاہ سے وہ خاصہ داور
بے ساختہ غش کھا کے گری خاک کے اوپر
اس حال پہ سب بیبیوں نے پیٹ لئے سر
گویا ہوا اس وقت بپا عرصہ محشر
حال حرم شاہ ہلالؔ اب نہ بیاں کر
کافی ہوا مجلس کا معال اب نہ بیاں کر



۱

جب سید مظلوم اکیلے رہے رن میں
وہ زخم لگے جسمِ شہنشاہِ زمن میں
طاقت نہ رہی فرط جراحت سے بدن میں
لکنت تھی، زباں خشک تھی، کانٹے تھے دہن میں
تھا درد کمر بھائی دلاور کے الم میں
اور ضعف بصر تھا علی اکبر کے الم میں

۲

جب حد سے سوا شہ پہ ہوئی پیاس کی شدت
تب ایک بلندی پہ گئے آپ بہ دقّت
دکھلا کے زباں خشک یہ فرمایا یہ منت
اے ظالمو ہے رحم کے قابل مری حالت
راضی ہوں کہ خنجر مری گردن پہ پھرادو
پر بہر خدا تھوڑا سا پانی تو پلادو

۳

یہ کہہ کے ہوا غش اسداللہ کا پیارا
رونے لگی یہ دیکھ کے فوج ستم آرا
لشکر میں ہوا شور جو رونے کا قضارا
اک مومنہ نے در سے کیا سب یہ نظارا
بیتاب ہوئی خیمہ سے باہر نکل آئی
ہاتھوں پہ لئے پانی کا ساغر نکل آئی

۴

خود رفتہ تھی گو خوف خدا سے وہ دل افگار
لیکن کبھی مردوں میں نہ نکلی تھی وہ زنہار
تھی غرق عرق، شرم سے ہلتا تھا تن زار
ساغر لئے پر آئی حضور شہ ابرار
دیکھا کہ کئی تیر کلیجہ میں گڑے ہیں
ہونٹوں پہ زباں نکلی ہے بیہوش پڑے ہیں

۵

رو رو کے جو مولا کو پکاری وہ کئی بار
کچھ غش سے افاقہ ہوا چونکے شہِ ابرار
تھی فرقت اکبر سے جو بینائی نہ زنہار
سمجھے کہ چلی آئی یہاں زینب ناچار
فرمایا کہ کیوں خیمے میں گھبرا گئیں زینب
میں زندہ ہوں اور بلوے میں تم آگئیں زینب

۶

چادر بھی ہے سر پر کہ نہیں یہ تو کہو آہ
ہم کو تو بہن کچھ نظر آتا نہیں واللہ
ہے جمع مرے گرد میں سب لشکر گمراہ
تم خیمے میں پھر جاؤ پئے روح یداللہ
مرجاؤں تو آکر تن صد پاش پہ رونا
جی کھول کے پھر بھائی کی تم لاش پہ رونا

۷

کی اس نے گزارش کہ یہ کیا ہوتا ہے ارشاد
میں خادمہ ہوں یاں پہ نہیں خواہر ناشاد
خیمے میں جو لونڈی نے سنی آپ کی فریاد
میں سمجھی کہ پیاسا ہے کوئی کشتۂ بیداد
مظلوم ہے اور سخت مصیبت میں پڑا ہے
پانی میں پلاؤں کہ ثواب اس میں بڑا ہے

۸

شہ نے کہا تو کون ہے اے عاشق اللہ
تب دست ادب جوڑ کے بولی وہ حق آگاہ
یہ خادمہ اس فوج کے ہمراہ ہے یا شاہ
گھر سے مجھے نکلے ہوئے گزرے ہیں کئی ماہ
راحت نہیں جب سے کہ میں بچھڑی ہوں مکاں سے
الہ ہے واقف کہ میں بیزار ہوں جاں سے

۹

راحت ہے میسر مجھے افضال خدا سے
سیراب ہوں سرد آب سے اور گرم غذا سے
پر کانپتا ہے قلب غریبوں کی صدا سے
موجود یہ پانی ہے اگر آپ ہیں پیاسے
جی کھول کے پیاس اپنی بجھا لیجئے حضرت
پہنچوں میں گھر اپنے یہ دعا کیجئے حضرت

۱۰

پوچھا شہ والا نے کہ گھر تیرا کہاں ہے
کی عرض کہ لونڈی کا مدینہ میں مکاں ہے
جس جا لحد حضرت خاتون جناں ہے
دنیا میں وہی جا شرف کون و مکاں ہے
کعبہ سے بھی رتبہ میں فزوں تر وہ زمیں ہے
مولا مرا جس جا ہے وطن میرا وہیں ہے

۱۱

فرمایا کہ بتلا ترے آقا کا ہے کیا نام
کی عرض حسین ابن علیؑ صاحب صمصام
رویا یہ سخن سن کے وہ زہرا کا گل اندام
فرمایا کہ اے عاشق سلطان خوش انجام
پہنچانتی ہے شکل ولی ابن ولی کی
خدمت سے مشرف ہے حسین ابن علیؑ کی

۱۲

کی عرض زیارت سے تو اب تک ہوں میں محروم
لیکن مرا ایمان ہے وہ خاصہ قیوم
فرمانے لگے اس سے شہِ بیکس و مظلوم
گھر تیرا مدینہ میں ہے اے مضطر و مغموم
کیوں تو نہ مشرف ہوئی اس حق کے ولی سے
گھر دور تھا کیا خانہ زہرا و علی سے

۱۳

اس نے کہا اک شب جو گئی واں یہ دل افگار
پوچھا تو کیا حضرت فضہ نے یہ اظہار
مسجد سے ابھی آئے نہیں سید ابرار
یہ سن کے پھری گھر کو میں اپنے بہ دل زار
مہلت نہ ملی ملنے کی پھر شاہ زمن سے
قسمت نے چھڑایا مجھے افسوس وطن سے

۱۴

مولا نے کہا خیر یہ معلوم ہوا حال
پر مجھ سے تو کہہ اپنے یہاں آنے کا احوال
سن کر یہ سخن رو کے پکاری وہ خوش اعمال
کیا عرض کروں آپ سے اے صاحب اقبال
میں آپ کی فریاد سے گھبرائی تھی آقا
یاں پانی پلانے کو تمہیں آئی تھی آقا

۱۹

کی عرض کہ اے قبلہ ارباب سخاوت
موجود ہے سب کچھ کہ خدا کی ہے عنایت
سیم وزر و گوہر کی مجھے کچھ نہیں حاجت
دو میری مرادیں ہیں یہ اے صاحب ہمت
پہنچوں میں گھر اپنے ابھی حضرت کی دعا سے
تازیست سہاگن رہوں افضال خدا سے

۲۰

شوہر ہے مرا شام کے حاکم کا مددگار
سنتی ہوں کہ سلطانِ عرب ہے کوئی سردار
وہ فوج سے حاکم کی ہے آمادۂ پیکار
اس شیر کی ہیبت سے مرے جاتے ہیں جرار
تیغ اس کی ہے وہ قہر کہ ہستی بھی فنا ہو
اس کی ہے مجھے فکر کہ اب دیکھئے کیا ہو

۲۱

عورت کے لیے قہر ہے دنیا میں رنڈاپا
فرمایئے اب رحم کرے خالق یکتا
سلطان عرب قتل ہو ہو فتح ہویدا
جاؤں میں سلامت مع شوہر سوئے بطحا
جاکر میں قدم پر شہ والا کے گروں گی
زینب کے بھی بانو کے بھی میں گرد پھروں گی

۲۲

روئے یہ سخن سن کے شہ بیکس و مضطر
فرمایا رنڈاپے سے تو ہاں موت ہے بہتر
بے قدر وہ عورت ہے جو شوہر نہیں سر پر
پرساں نہیں کوئی کہ لٹے یا پھرے در در
راحت کہاں منہ اشکوں سے دھونا نہیں ملتا
اکثر ہیں وہ رانڈین جنہیں رونا نہیں ملتا

۲۳

یہ کہہ کے پھرے جانب قبلہ شہ ابرار
کی حق سے دعا ہاتھ اٹھا کر یہ کئی بار
اے قاضی حاجاتِ جہاں مالک ومختار
اے عقدہ کشا، راہ نما، راحم وغفار
دامن کو اب اس کے گل امید سے بھر دے
یا ربِّ عُلا شام کے حاکم کو ظفر دے

۲۴

سلطان عرب قتل ہو اے مالک تقدیر
اس فتح سے خورسند ہو یہ لشکر بے پیر
سر ننگے پھرے بلوے میں مقتول کی ہمشیر
بیمار پسر اس کا ہو وابستہ زنجیر
نیزے پہ سر اس شہ کا ستمگار چڑھائیں
ناموس کو اس کے سرِ بازار پھرائیں

۲۵

بچوں کو بھی اس کے نہ امان دیجیو یارب
بندھ جائیں سب اک رسّی میں اس شہ کے حرم اب
تاراج ہو گھر زیور و اسباب لٹے سب
صحراؤں میں دن گذرے تو زندان میں کٹی شب
حالت ہو بری اب ستم و جور سے سب کی
دفنا نہ سکیں لاش بھی سلطانِ عرب کی

۲۶

یہ خالق اکبر سے دعا کرتے تھے حضرت
گویا یہ فرشتوں سے ہوا تب لب قدرت
جو آگئی بس جوش میں معبود کی رحمت
کیوں دیکھتے ہو تم مرے جانباز کی ہمت
جو حق سخاوت ہے ادا کرتا ہے شبیرؑ
دشمن کو ظفر ہو یہ دعا کرتا ہے شبیرؑ

۲۷

کانپے یہ سخن سن کے ملک بام فلک پر
یاں مومنہ سے رو کے مخاطب ہوئے سرور
مقبول دعا ہوگئی راضی ہوا داور
لے فتح ہوئی شام کے حاکم کی مقرر
ہوگی نہ وغا زور گھٹا عاشق رب کا
اب شمر گلا کاٹے گا سلطانِ عرب کا

۲۸

پھر اس سے یہ فرمانے لگے سید ذی جاہ
اک خادمۂ فاطمہؑ میرے بھی ہے ہمراہ
کہتی ہے کہ یثرب میں نہیں کل کا شہنشاہ
کوفہ کی طرف آیا ہے ابن اسداللہ
ساتھ اس کے سب اولاد یداللہ و نبیؐ ہے
فضہ بھی ہے بانو بھی ہے اور بنتِ علیؑ ہے

۲۹

سن کر یہ سخن عرض یہ کی اس نے بمنّت
لے چلیئے مجھے واں پئے خاتون قیامت
میں خادمۂ فاطمہؑ کی کر لوں زیارت
ساتھ اپنے اسے لائے درِ خیمہ پہ حضرت
فرمایا کہ رتبے ہیں بڑے آل عبا کے
تھم جا یہاں میں لاؤں اسے خیمے سے جا کے

۳۰

مشتاق جو ماں جائے کہ تھی زینب ناچار
سنتے ہی صدا خیمہ میں رکنا ہوا دشوار
آئی درِ خیمہ پہ معہ عترتِ اطہار
دیکھا کہ ہیں مجروح بہت سید ابرار
زخمی ہے جبیں گیسوؤں پر خاک پڑی ہے
پہلو میں مگر ایک ضعیفہ بھی کھڑی ہے

۳۱

بیتابی میں زینب نے جو پردے کو اٹھایا
اس مومنہ کو جلوۂ عارض نظر آیا
پھر کانپ کے اس نے سخن یاس سنایا
ہے ہے مجھے یہ کیا مری قسمت نے دکھایا
سرتاج زمین و شرفِ عرشِ بریں ہیں
یارب یہ کہیں میری خوزادی تو نہیں

۳۲

پہچان کے پھر گرد پھری اور یہ پکاری
مخدومہ کونین مری، میں ترے واری
سونلا گئی، کیا ہوگیا صورت کو تمہاری
کس طرح سے اس دشت میں آئیں مری پیاری
سرخ آنکھیں ہیں کیا شب کو نہیں سوئی ہو بی بی
پلکوں پہ ورم کیسا ہے کیا روئی ہو بی بی

۳۳

چھوڑا مرے آقا کو کہاں یہ تو بتاؤ
شرمندہ ہو کس واسطے گردن تو اٹھاؤ
صدقے گئی لونڈی سے نہ احوال چھپاؤ
مشتاق کو پھر جلوۂ دیدار دکھاؤ
کیا غم ہے جو یوں ہاتھ کلیجہ پہ دھرا ہے
کہیے تو یہ ماتھے پہ لہو کس کا ملا ہے

۳۴

حضرت کی طرف دیکھ کے بولی یہ وہ مضطر
میرا تو نہیں کوئی، سوا آپ کے خواہر
دو بیٹے ابھی میں نے فدا کر دیے ان پر
پر رد نہ ہوئی ان کی بلا وائے مقدر
پالا تھا جنہیں وہ بھی سفر کر گئے بی بی
ماتھے پہ لہو جن کا ہے وہ مر گئے بی بی

۳۵

کیا اپنی مصیبت کہوں میں درد کی ماری
اس دشت میں لوٹی گئی دولت مری ساری
اب بھائی کے در پے ہے یہ سب فرقہ ناری
پہچان تو، تو کون ہے یہ عاشق باری
استادہ ترے پاس جو خالق کا ولی ہے
خواہر یہ مرا بھائی حسین ابن علی ہے

۳۶

یہ سن کے گری قدموں پہ وہ اور یہ پکاری
آقائے غریباں تری ہمت کے میں واری
لونڈی نے جو کی عرض بصد منت وزاری
کی حق سے دعا یہ کہ ظفریاب ہوں ناری
کنبہ کی تباہی پہ نظر تک نہیں آقا
ہم سب سے عزیز آپ کو سر تک نہیں آقا

۳۷

یہ کہہ کے گئی وہ تو سوئے لشکر بدخواہ
کیا حال بیاں واں کا کروں شق ہے جگر آہ
اور خیمہ میں رخصت کو گئے سید ذی جاہ
سیدانیان روتی ہیں بصد نالہ جاں کاہ
اب آگے ہلالؔ ان کی مصیبت نہ بیاں کر
شبیرؑ کی ہمشیر سے رخصت نہ بیاں کر

ڈاکٹر عظیم امروہوی کی دیگر کتابیں

1	حدیثِ غم	نظم	لکھنؤ
2	حسینؑ اور زندگی	نظم	رامپور
3	تحریک نینوا	نظم رنثر	امروہہ
4	شرحِ غم	نظم	امروہہ
5	مرثیۂ عظیم	نظم	کراچی
6	حسینیت ایک آفاقی تحریک	نظم رنثر	امروہہ
7	مرثیہ نگارانِ امروہہ	نثر	کراچی
8	بین الاقوامی محرم نمبر	نظم رنثر	دہلی
9	قرآن اور حسینؑ	نظم	دہلی
10	رسولِ اعظمؐ	نظم	دہلی
11	اتحاد اسلامی	نظم	دہلی
12	ملاقات امام	نثر	دہلی
13	مفسّرِ نور	نثر	دہلی
14	میرے خوابوں کا جہاں	نثر	دہلی
15	خاندانِ شمیم کی مرثیہ گوئی	نظم رنثر	دہلی
16	نقش حیات	نظم	امروہہ
17	آفتابِ انقلاب	نظم	دہلی
18	طوافِ نور	نثر	دہلی
19	شمیم سخن	نظم	دہلی
20	رسولیات	نظم	دہلی

Hilal -e- Gham

(Rasaee Kalam Hilal Amrohvi)

Tahqeeq wa Tadween

(Khandan-e-Kamal Amrohi Ki Rasaee Adab Main Khidmaat)

Dr. Azeem Amrohvi

Peshkash
AALAMI MARSIYA CENTRE
New Delhi